ناشر

ادبی مرکز

۳۵۹۔ پنڈارہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱

اشاعت اوّل   قیمت فی جلد تیرہ روپیہ علاوہ محصول

فہرست مضامین

صفحہ
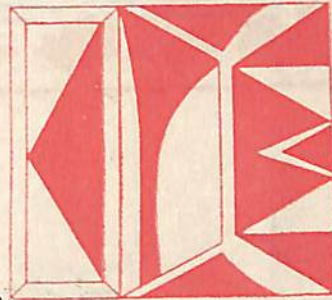
مصنّف	ساؔغر نظامی
آرٹسٹ	جسونت سنگھ
خوشنویس	راج کرشن کپوُر
ناشر و مالک	ذکیہ سُلطانہ نیّر
طباعت	دلّی پرنٹنگ پریس
سرِورق اور پس منظر کی طباعت	دیال پرنٹنگ پریس دہلی
سنِ اشاعت	جولائی ۱۹۶۷ء
مقامِ اشاعت	ادبی مرکز ۳۵۹ پنڈارہ روڈ نئی دہلی
نگران	شہریار پرؔواز

ادب دوست غلام محمدؐ صادق کے نام !
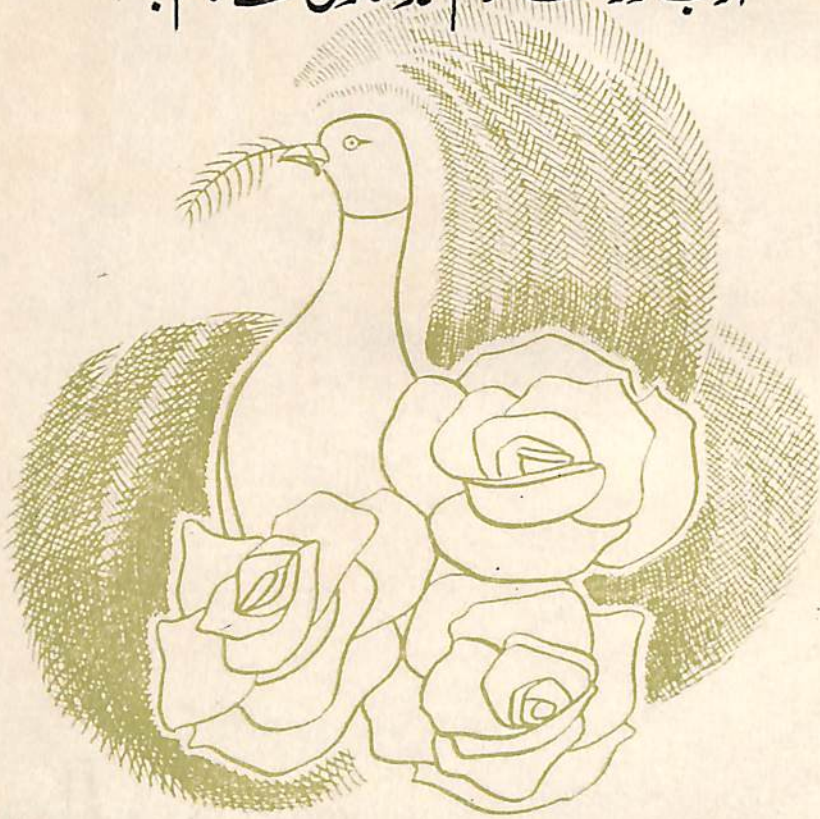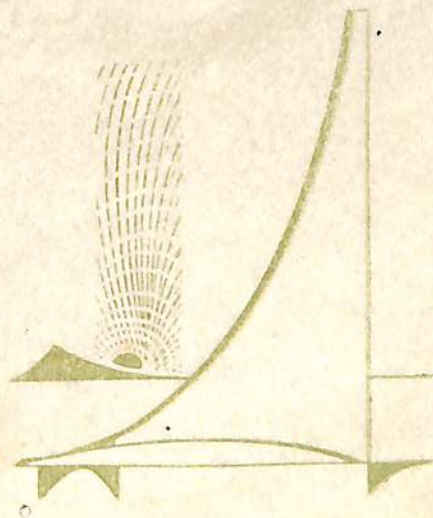
راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین

راشٹرپتی بھون

نئی دہلی -۴

مورخہ ۸ جولائی ۱۹۶۷ء

مجھے بڑی خوشی ہے کہ جناب ساغر نظامی نے اپنی نظم "نہرو نامہ" پر چند سطریں لکھنے کا موقع دیا اور مجھے یہ سعادت بخشی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے جو عقیدت مجھے تھی اور اُن کی زندگی اور اُن کے افکار سے جو روشنی مجھے ملتی رہی تھی اس کے اقرار سے اس نظم میں ساغر صاحب کی ہم نشینی حاصل کر سکوں۔

"نہرو نامہ" ایک طویل نظم ہے جو صرف پنڈت جواہر لال نہرو کا مرثیہ ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کی حکیمانہ تعبیر بھی ہے۔ نہرو ہر بڑی شخصیت کی طرح کچھ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل تھے جیسے حُسن، خیر، عدل اور حق۔ ساغر صاحب نے اس نظم میں اُن قدروں کا شدّتِ احساس اور گیرائیِ فکر کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے سہارے حیاتِ انسانی کیسے خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتی ہے اور نہرو کیسے انہیں کی مدد سے ویرانۂ حیات میں رنگ و بُو کی ایک حسین دُنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے پہلے انہیں جہادِ آزادی میں مصروف ہونا پڑا کہ آزادی بغیر تعمیر تو ممکن نہیں مگر نہرو یہ بھی جانتے تھے کہ آزادی، بغیر تعمیری جہد کے بے سُود ہو کر رہ جاتی ہے

سامراج سے کامیاب لڑائی پہلا قدم تھا۔ اس سے آگے وہ مسلسل جنگ آزمائی تھی جو ملک سے توہّم و جہل، افلاس و نکبت، قدامت پرستی اور تنگ نظری کے خلاف کرنی تھی

ساغر صاحب نے نصف صدی کی پرورش یافتہ قوّتِ نظم نگاری اور گہری فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اس حقیقت کی طرف عمیق تاثّر اور جوش کے ساتھ شعری پیکروں کی تخلیق کی ہے

اس طویل نظم میں وہ حِصّہ بڑا گراں قدر ہے جس میں ساغر صاحب نے "نہرو اور موت"

کا تخیلی مکالمہ بڑی بالغ نظری سے پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں

بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں مگر — وہی پستی وہی بلندی ہے
اک طرف خاک اک طرف انجم — اک طرف پھول اک طرف کانٹے
اک طرف بھیڑ ہے اندھیروں کی — اک طرف نور کا تلاطم ہے
چشمہ جاری ہے زندگی کا مگر — تشنہ کامی سی تشنہ کامی ہے
ساری تعمیر حسرتِ تعمیر! — ناتمامی سی ناتمامی ہے
آخری سانس میری کہتی ہے — ناتمامی، تمام بھی ہوگی
کامیابی کے روپ میں اک دن — اک نئی زندگی کی لے بن کر

ذرّے ذرّے میں مسکرائے گی
چپّے چپّے میں جگمگائے گی

ساغر صاحب کو اس کا پورا احساس ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی کے چلے جانے سے بھی زندگی کے امکانات ختم نہیں ہو جاتے ۔ زندگی ہر لحظہ ہر آن، نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہے ۔

ساغر نے اس حقیقت کے پیشِ نظر نئے نہرو کی آمد اور نئے اور خوش آیند امکانات کی بشارت دی ہے

ساغر صاحب نے یہ نظم لکھ کر نہ صرف ملک کے معمارِ اعظم اور محبوبِ رہنما جواہر لال کے ساتھ گہرے خلوص کا ثبوت دیا ہے بلکہ اُن قدروں کی تبلیغ کی ہے جو جواہر لال کی زندگی کا تانا بانا تھیں اور جن کی کامیابی پر وطن کی ترقی، امنِ عالم اور انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہے

یہ ایک یادگار خدمت ہے جس کے لئے قوم کو شاعر کا ممنون ہونا چاہیئے۔ یہ کارنامہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر ہے

ذاکر حسین

پروفیسر رشید احمد صدیقی

تبریک

پنڈت جواہر لعل کی وفات پر ساغرؔ صاحب کی یہ نظم (نہرُو نامہ) منفرد حیثیت رکھتی ہے
پنڈت جی کے اعلیٰ خیالات، اعلیٰ کردار اور بے نظیر گوناگوں خدمات کا نقشہ شاید ہی ہندوستانی
زبانوں کے کسی دُوسرے شاعر نے اس تفصیل، عقیدت اور حُسن کاری سے پیش کیا ہو۔

یہ "کارنامہ" ساؔغر صاحب ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس لئے کہ پنڈت جی سے اُن کو والہانہ شیفتگی رہی ہے۔ اُردو شاعری کے مانے ہوئے اداشناس ہیں۔ موسیقی کے بھید بھاؤ سے واقف اور ڈرامے کے انداز واثر کو پہچانتے ہیں۔ شخصی ارادت، شاعری، موسیقی اور ڈرامے سے بیک وقت کشید ہو کر نکلے گی تو وہی چیز بن جائیگی جس کے بارے میں کہا گیا ہے "تلوار بن گئی ہے"!

نظم میں اعلیٰ انسانی صفات یا اقدارِ عظیمہ جسم وجاں میں منتقل ہو کر گذری ہوئی بڑی اور بزرگ رُوح کی خدمت میں اپنے کرب والم کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ جیسے "تعزیتِ مہر و وفا" کرنے والا پنڈت جی کے بعد کوئی باقی نہ رہا ہو

اس نظم کی تخلیق پر ساؔغر صاحب یقیناً ہماری تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں
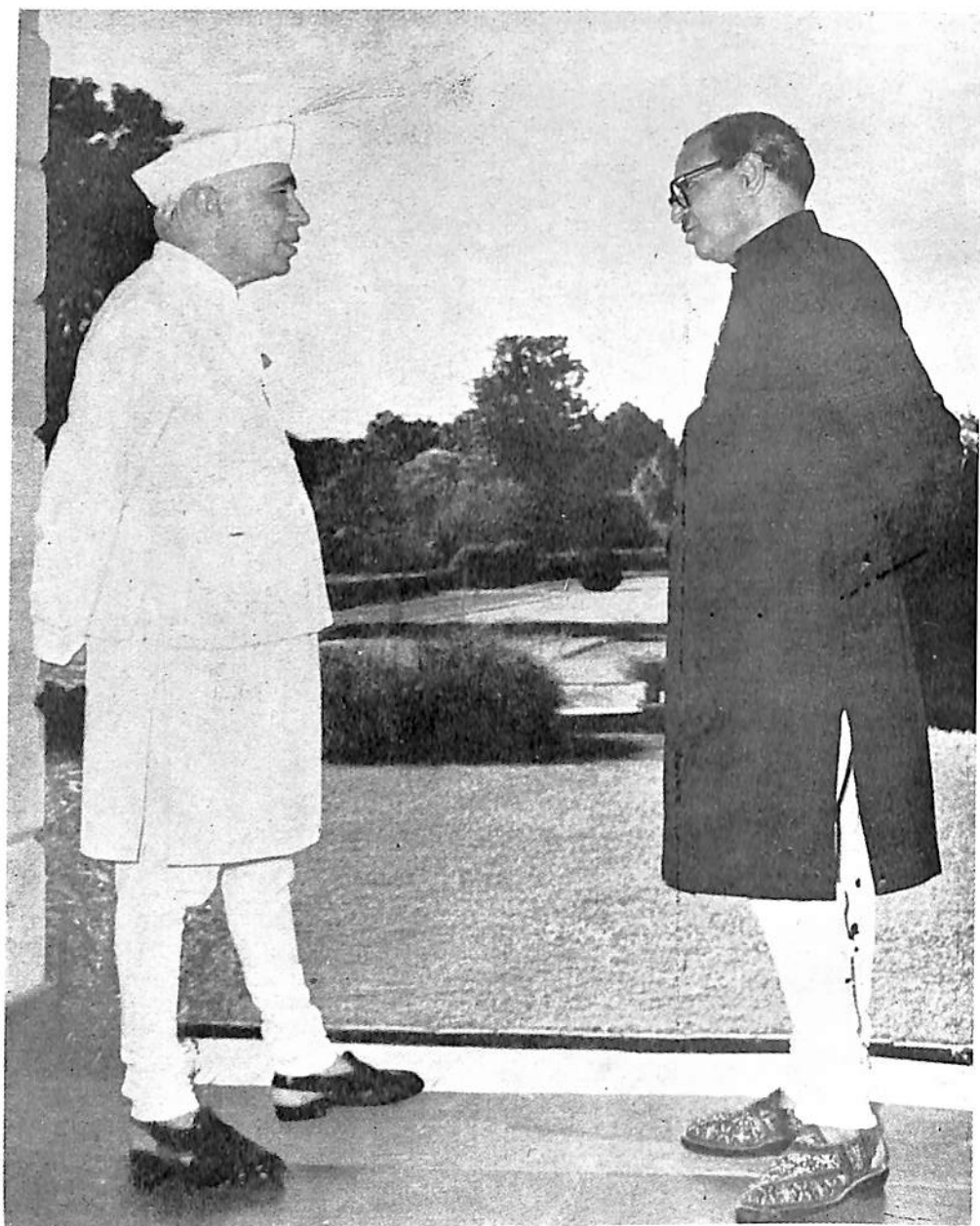
ساغرؔ نظامی اور پنڈت جواہر لال نہرو

ڈاکٹر تارا چند

گنجِ گراں مایہ

یہ کون متبرک ہستیاں ہیں جو عظمتِ انسانی کی جاوداں بزم میں رونق افروز ہیں
آیئے ان کے تعارف کی سعادت حاصل کریں۔

ان میں کچھ تو وہ سُورمیر ہیں جنہوں نے قومی آزادی کی جنگوں میں جانوں کی بازی لگائی
ذہنی اور سیاسی غلامی سے نجات دلائی۔

کچھ وہ مصلحِ قوم ہیں جنہوں نے سماجوں کو روایتی اوہام کے خارزاروں سے نکالا اور
ایک خوش آیند مستقبل کی بشارت دی۔

کچھ وہ فرشتہ صفت پیشوا ہیں جنہوں نے عالمِ انسانی کو بہیمی جذبوں، آدمیّت سوز
منصُوبوں اور اشتعال انگیز تحریکوں سے متنبہّ کیا، امن و آشتی کا جاں فزا پیام سُنایا۔

پھر ان میں وہ برگزیدہ انسان ہیں جنہوں نے فرد اور جماعت کو رُوح پرور اعلیٰ اقدار
کی طرف توجہ دلائی اور آدمی کو اشرف المخلوقات کے مرتبے کا اہل بنایا۔ انہوں نے جہالت
خود غرضی اور ہر قسم کی فرومائیگی کے خلاف جہاد کیا۔ زمین پر صداقت کی ضیا پاشی کی۔ دلوں کی

محفلوں میں پریم کے چراغ جلائے۔ خاورِ خیر کے چہرے سے شر کی بدلیوں کو دُور کیا یہاں تک کہ اس کی سُنہری کرنیں اُمڈیں اور انسان رقص کناں و نعرہ زناں اُن کے سہارے اس ماورائی نُور کی طرف پروانہ وار لپکے۔

یہی وہ ہستیاں ہیں جن کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

انہی معدودے چند سربرآوردہ ہستیوں میں جواہر لعل نہرو شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی ہندوستان کے لئے وقف کی، ساری عمر برطانوی سامراج سے جدوجہد کر کے گذاری۔ انگریزی غلامی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ میدانِ شجاعت میں مردانگی کے وہ جوہر دکھلائے جن کی مثال ملنی مشکل ہے ان کے ارادے اور عزم کی آہنی چٹانوں سے استبداد کے پیکر ٹکرائے اور چکنا چُور ہوئے۔ یہ استعمار کے طوفانوں، آمریت کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر کھڑے رہے اِن کے دردمند دل میں دھڑکنیں تھیں جنہوں نے فرقہ وارانہ غیریت کے پردے چاک کئے بچھڑوں کو ملایا، انسانی برادری کے تاروں کو جوڑا۔ تخیّل، سمندر کی گہرائیوں سے گہرا آسمانوں کی بلندیوں سے بلند تھا، اُس نے ہندوستان کے مستقبل کا شاندار ہیولہ مساوات، برادری، آزادی اور رواداری کے مواد سے تیار کیا۔

جواہر لعل شرافت کا پُتلا تھا اُس نے سخاوت کے دریا بہائے، کمزوروں، غریبوں، مسکینوں کو سہارا دیا۔ زبردستوں، ظالموں اور مغروروں کو فروتنی کا سبق سکھایا۔ وہ علم کا خزانہ

تھا، تقریر اور تحریر کا دھنی، مجلسوں میں بیٹھتا تو دانش، فن اور سیاست کے موتی بکھیر دیتا ہجوموں میں شامل ہوتا تو اس کی گرج لاکھوں میں گونجتی اور اُن کے دلوں کو تڑپاتی! انسان دوست تھا۔ انکی صحبت سے خوش ہوتا تھا مگر وجدان کی تنہائیوں میں کھویا رہتا تھا۔ بچّوں میں بچّہ، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں تجربہ کار سال خوردہ بزرگ دکھائی دیتا تھا۔ حوصلوں میں وسعت تھی کم ہمتّی، پست خیالی اور بداخلاقی سے تمام تر بے تعلق تھا۔ خودداری اور وقار کا حد درجہ پاس تھا مگر مزاج قلندرانہ تھا۔

جواہر لعل دُنیا کی نعمتوں کو ٹھکراتا نہ تھا بلکہ اُن سے لُطف اندوز ہوتا تھا مگر انہیں نفس پر مسلّط نہیں ہونے دیتا تھا۔ آقا تھا، بندہ نہیں، وہ ظاہری اور باطنی حُسن کا پرستار تھا شاعر طبع تھا، ادب کا پجاری تھا، قدرتی منظروں کے جمال کا دلدادہ تھا، کہساروں، سبزہ زاروں، آبشاروں سے والہانہ عشق رکھتا تھا۔

وہ زندگی سے کھیلتا تھا، خطروں کو خوش آمدید کہتا تھا، آرام کو حرام سمجھتا تھا اور عملِ پیہم کو کامیابی کا راز!

وہ ایک شعلۂ آتشیں تھا جو ہندوستان کے اُفق پر نمودار ہوا۔ اس کی تابش نے سرد دلوں کو حرارت، سکڑے ٹھٹھرے منجمد اعضاء کو حرکت و توانائی بخشی۔ قوم کے مُردہ جسم میں رُوح پھونکی۔ یہ شعلہ بجلی کی طرح فضاؤں میں پھیلا، بادلوں پر کوندا، پھر آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا دُنیا کی

نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لیکن نہیں، وہ ناپید نہیں ہوا۔ وہ آسمانوں کی پہنائیوں میں، کہکشاں کے جھرمٹوں میں، ستاروں کی انجمن میں تابندہ ہے پائندہ ہے اس کا نور ہمارے ذہنی اُفق پر چمکتا ہے وہ راستی، محبت اور سلامتی کی راہ پر قطب کا ستارہ ہے جو منزلِ مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے

کن الفاظ میں نہرو نامہ کے مصنف کی تعریف کروں۔ ساغر صاحب کو دنیا جانتی ہے اردو کے شاعروں میں اُن کا مرتبہ بلند ہے۔ ایک ملے جُلے کلچر کے علم بردار ہیں۔ ان کے قومی ترانے مُلک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے کالیداس کے مشہور ڈرامے شکنتلا کا اردو نظم میں ترجمہ پیش کیا، ان کی نظموں میں ہندوستانی رسم و رواج، ہندوستانی مناظرِ قدرت، ہندوستانی حُسن و جمال کی دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی نشاط انگیز شاعری میں لطافت بھی ہے بلاغت بھی، زبان پیاری، طرزِ ادا رسیلی، تخیّل رُومانی ہے۔ مجھے یقین ہے نہرو نامہ ان کی شہرت میں چار چاند لگائے گا۔

اس دیدہ زیب نگار خانے میں نہرو کی جلوۂ صد رنگ ہستی کے نقوش بڑی آب و تاب کے ساتھ اُبھرے ہیں ان سے ادب کو زینت اور قومیّت کو سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اس شاہکار کے لئے میں ساغر صاحب کو دل سے مُبارکباد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں یہ گنجِ گراں مایہ مقبولِ خاص و عام ہو گا۔

ڈاکٹر سیّد محمود

فن کی معراج

۳۵ برس ہوئے ساغر سے میری پہلی ملاقات موضع سوگھرپور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی جہاں وہ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ کئی دن تک ان کا ساتھ رہا۔ اُس وقت وہ "بادۂ مشرق" کے شائع کرنے کی فکر میں تھے۔ ان کا کلام اور پھر ان کی طرزِ ادا جو سب کو پسند آتی، مجھے بھی بہت بھائی۔ جب ساغر اپنا کلام سُناتے تو بڑے سے بڑے مجمع پر چھا جاتے۔

کچھ عرصے بعد ساغر سے میری ملاقات الٰہ آباد میں ہوئی جہاں میں آنند بھون میں بحیثیت کانگریس کے جنرل سیکرٹری کے آیا جایا کرتا تھا۔ آنند بھون میں کانگریس کے کام کرتا۔ احباب جمع ہوتے اور ساغر کا پُرجوش و پُرزور قومی کلام سُن کر محظوظ ہوتے۔ میرے دورانِ قیامِ الٰہ آباد میں ساغر برابر وہاں آیا کئے وہ مختلف جلسوں اور نجی محفلوں میں اپنا کلام سُنا کر لوگوں کو اپنا مدّاح بنا لیتے۔

اُس زمانے میں کملا نہرو علیل تھیں۔ ساغر ان کو اکثر اپنا کلام سُناتے اور وہ ان کے کلام و ترنّم کو بہت پسند کرتیں۔

انہیں دنوں کی بات ہے کہ یونٹی کانفرنس الہ آباد (۱۹۳۳ء) کے موقع پر ایک بہت بڑے جلسے میں ساغر نے اپنی ایک نظم سُنائی اور جلسے نے بڑی داد دی۔ اُس وقت سے ساغر نے ایک قومی شاعر کی شہرت حاصل کر لی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد بھی اُن کی بڑی قدر کرتے۔ مولانا آزاد تو جب انہیں دیکھتے تو بے تکلفانہ یہ مصرع پڑھتے ؎

ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

یہ ساغر اور ان کی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ وہ خوش پوش، خوش وضع اور خوش نوا شاعر تھے۔ ان کی زبان میں بڑا رچاؤ تھا اور جو بات سب سے زیادہ اثر رکھتی تھی وہ یہ تھی کہ ان کی شاعری میں ہندوستانی سبھیتا اور سنسکرتی کا حُسن بہت نمایاں تھا مجھے یاد ہے کہ ساغر کی مشہور نظم جمنا کے اس مصرع پر کہ ؎

کرشن کی بنسی کا اک بہتا ہوا نغمہ ہے تو

کے بارے میں میں نے کہیں لکھا تھا کہ:-

"اگر شاہجہان زندہ ہوتا تو شاعر کو سیم و زر میں تلوا دیتا۔"

اب ایسے بادشاہوں کا زمانہ تو نہیں رہا کہ ساغر کو سونے چاندی میں تلوا
دیں لیکن اس کا نعم البدل وہ زبردست شہرت، پذیرائی اور قبولیت ہے جو اُن کی
شاعری نے ملک میں حاصل کی۔

ساغر نے ناسازگار حالات کا ہمیشہ مقابلہ کیا ہے اور اردو ادب میں جو بلند مقام ان
کو حاصل ہوا ہے وہ ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ساغر پنڈت نہرو اور ان کے خاندان کے ہمیشہ مدّاح اور گرویدہ رہے۔ ان کو
پنڈت نہرو سے جو خاص لگاؤ اور محبّت رہی، نہرو نامہ اُسی کا پرتَو ہے۔

نہرو نامہ پنڈت نہرو کے اعلیٰ کردار، بلند و برتر خیالات، عدیم المثال کیریکٹر
اور ان کے نہ مِٹنے والے کارناموں کی ادبی تاریخ ہے۔

غرض کہ نہرو نامہ ساغر کے فن کی معراج ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اردو ادب
کا یہ غیر فانی سرمایہ ثابت ہو گا۔

۲۰۔ تغلق کریسنٹ
نئی دہلی

۱۲ر جولائی ۱۹۶۷ء

سیّد سجّاد ظہیر

مُستقبل کا راستہ

میں حضرت ساغر نظامی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنی تازہ ترین شعری تخلیق "نہرُو نامہ" مجھے چند روز کے لئے پڑھنے کو دیا۔ میرا خیال ہے کہ :-

یہ طویل نظم نہ صرف ساغر صاحب کے گراں قدر شعری سرمائے بلکہ پورے اُردو ادب میں ایک ایسی اہمیّت کی حامل ہے جو ابھی تک ہماری زبانِ اُردو کی کسی دُوسری نظم کو حاصل نہیں ہے۔

جواہر لال نہرُو کی عظمت یہ بھی ہے کہ ان کے کردار اور تصوّرات نے ان کی وفات کے فوراً بعد ہی ساغر صاحب کو ایک ایسی نظم کہنے کا وجدان عطا کیا جس میں قومی زندگی، نیز دورِ جدید کے اہم ترین سماجی مسائل کو ایک زندہ، متحرّک اور باشعور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھ کر متعدد شعری تصویروں کے وسیلے سے اپنے حال کو بدل کر ایک نئے

انسانی، عقلیت پسند، جمہوری اور پُرامن اشتراکی مستقبل کی جانب آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا ہے۔

اس نظم کو لکھنے کے بعد ساغرؔ صاحب کا ادبی مرتبہ پہلے سے کئی گنا زیادہ بلند ہو گیا ہے اور میں انہیں اس کارنامے پر دلی مُبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۷-۲۴ حوض خاص

نئی دہلی - ۱۶

۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء

پروفیسر انور صدیقی

عہد آفریں تخلیق

زندگی کے جمال و جلال کا آئینہ خانہ

آنجہانی پنڈت جواہر لعل کی شخصیت خود ایک بھرپور نظم تھی، اثر انگیز اور وجد آفریں اس شخصیت میں رزمیہ شاعری کی صلابت اور گرمی، ڈرامائی عمل کی مقدر آفریں فعالیت اور غنائی شاعری کی شبنمی لطافت اور نغمہ در نغمہ کیفیات کی بیکراں خوابناک ایمائیت کے عناصر کا خوشگوار امتزاج تھا۔

اس بھرپور نظم کا جس کا دوسرا نام نہرو تھا، ساغر صاحب نے ذاتی طور پر کوئی نصف صدی مطالعہ کیا۔ اس کے سوز و ساز، کرب و مستی، نشاط و محرومی اور فتح و شکست سے اپنے شعری احساس کو ہم آہنگ کیا، اس کے خوابوں، وسیع تر خوابوں میں خود اپنے خوابوں کی چاندنی کا پرتو محسوس کیا۔ نہرو نامہ کے ہر شعر میں انہیں خوابوں کی تجسیم ہے۔

یہ خواب بڑے ہی عظیم تھے اور مقدس، یہ خواب ایک "شبابِ خوگرِ دار و رسن"

کے خواب تھے۔ انسانی عزائم کے شہپروں کی آزاد جنبش کے خواب تھے، جنگ کے سیاہ اور کریہہ بادلوں سے ابھرتے ہوئے عالمِ نو کے خواب تھے۔ عروجِ آدم کی مسرت میں جشنِ بہاراں کے خواب تھے۔ تاریخی شعور کی پلکوں پر سجے ہوئے نئے ہندوستان کے خواب تھے۔ ان خوابوں میں انسانی مقدّر کے جتنے بھی نکتے تھے ساغرؔ صاحب نے پورے فنکارانہ خلوص کے ساتھ اپنے احساس کے دامن میں سمیٹ کر اس نظم کی تخلیق کی ہے۔ اسی بنا پر میرا تاثّر ہے کہ یہ نظم خود نہروؔ کی شخصیّت کی طرح بڑی ہمہ گیر، وجیہہ اور جمیل ہے۔

ساغرؔ صاحب ہماری اُس ادبی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کا رُومانی طرزِ احساس سے قرب اب مسلّم ہے۔ رومانیت کی صاعقہ بردوش انقلابیت، دفور، خوابناکی اور ماضی سے افسُردہ، نشاط انگیز ربط، یہ وہ خصوصیات ہیں جو اس دَور کے شعر و سیاست کے علاوہ ثقافت کے ہر مظہر میں کارفرما نظر آتی ہیں۔

نہروؔ ہماری حسّی تاریخ کے اُس دور کے نمائندے تھے اور ساغرؔ صاحب اُس کے نغمہ گر ہر بڑی شخصیت کی طرح نہروؔ کی شخصیت میں ایک طرح کی ہوشمند رومانیت تھی۔ زندگی اور زمانے سے اُن کے ردِعمل کی نہج رومانی تھی وہ خوابوں کے ذریعہ حقائق کی توسیع کے قائل تھے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہندوستانی زندگی کے اِس دَور کے فنکاروں اور مدبّروں میں مغرب کے برخلاف زیادہ توازن اور صحت مندی تھی۔ یہاں ذات کے وسیلے سے حقائق کا ادراک ضرور

ہوتا تھا مگر ذات اپنی جگہ پر وسیع تھی اور اجتماعی احساس سے ہم آہنگ۔

ہر رومانی نسل کی طرح اس نسل کے افراد بھی ماضی سے ایک طرح کا تخلیقی ربط رکھتے تھے۔ اُس کی بازیافت سے حال کو سمجھنے اور مستقبل کو منوّر کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔

نہرو کے طرزِ احساس سے ساغر صاحب کے طرزِ احساس کا یہ اشتراک اس نظم کی اساس ہے اور اسی حسین اشتراک نے (جس کے پیچھے تاریخی اور زمانی اشتراک کے رشتے بھی ہیں) اِس نظم کو بلند ترین شعری اظہار بنا دیا ہے۔ اس اشتراک کے چند نقوش ملاحظہ فرمائیے۔

للّٰہ الحمد میرا مشرب ہے — باغیوں کا قصیدہ خواں ہونا

للّٰہ الحمد میرا مذہب ہے — حق پرستوں کا ترجماں ہونا

مجھے القا ہوئے ہیں نصف صدی — سرفروشانِ انقلاب کے گیت

اپنی دھرتی پہ جو نثار ہوئے — جو شہادت کا افتخار ہوئے

ہر نفس جن کا شمعِ آزادی — جن کے خوں سے چراغ جلتے ہیں

اُن شہیدانِ انقلاب کے گیت

مجھے الہام ہوتی آئی ہے — عندلیبانِ شعلہ بار کی حمد

ساکنانِ جہانِ دار کی حمد

منقبت لالہ گوں جوانی کی — خوں میں ڈوبے ہوئے شباب کی حمد

نعرۂ الصبوح ہے میـــرا صبح کے تازہ آفتاب کی حمد

یہ ہے وہ رُومان خیز انقلابی شعلہ نفسی جس کی بنیاد پر یہ نظم لکھی گئی ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ساغرؔ صاحب نے اپنے انقلابی مشرب کے تسلسُل کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ "لالہ گوں جوانی" اور "خوں میں ڈوبے ہوئے شباب" کا مسلک رومانی ہے اور انگریزی شاعر لارڈ بائرن کی یاد دلاتا ہے جو اپنے آپ کو "اضطراب کا شہزادہ" کہتا تھا۔

"رسم ورہ رومانیاں" کے مطابق خطر پسندی، مہم جوئی، حرکت و عمل اور جہد و پیکار زندگی کی سرشت میں داخل ہیں۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر بعض لوگوں نے رومانیت کو توانائی کے مسلک (Cult of Energy) سے تعبیر کیا ہے۔

میرے خیال میں اسی توانائی نے نہرُو کی شخصیت کو جنم دیا اور یہی توانائی ساغرؔ صاحب اور اُن کے شعری کارناموں کی بھی خالق ہے۔

میں نے ساغرؔ صاحب کے سلسلے میں اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ زندگی کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہے ہیں۔ فکر و عمل کے لحاظ سے وہ زندگی کے ساتھ وضعدار رہے ہیں اور زندگی اُن کے ساتھ۔

غالباً اسی وجہ سے ساغرؔ صاحب کا زندگی سے معاملہ ہمیشہ اثباتی رہا ہے۔ وہ اُسے اُس کے تمام تر نوش و نیش کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئی۔ اے۔ رچرڈس

(I. A. Richards) کی اصطلاح میں اُردو کے سب سے زیادہ نارمل شاعر ہیں۔ ان کے احساس میں کوئی گرہ نہیں۔ وہ صاف جذبوں اور شفّاف خیالوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی زندگی میں بھی سلامت روی اور سلیقہ مندی ہے اور شاعری میں بھی۔ ان کی انا سُلگتی ہے بھبکتی نہیں۔ وہ دھیمے، نرم اور پائدار احساس کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی کے غلط مظاہر کے خلاف خفگی ہے مگر خشُونت نہیں۔ ان کے لہجے میں انسانی ترمی ہے، کرختگی نہیں۔ خود اس نظم میں بہت سے ایسے مقام آئے ہیں جہاں کوئی دُوسرا ہوتا تو "کف دردہاں" ہو جاتا۔ مگر ایسے مرحلوں پر بھی ساغر صاحب اعلیٰ ترین انسانی اظہار کے شرف و شرافت کے اصُولوں سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور بجائے برہم و بیزار ہونے کے ایسے خیالی پیکر (Images) کی تخلیق کرتے ہیں جن سے قاری کے اندر اِن مظاہر کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ یہی اعلیٰ فنکارانہ رویّہ بھی ہے اور طریقۂ کار بھی۔

ساغر صاحب تنقیدِ حیات کے فریضے سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ مگر اس تنقید میں بڑی دلسوزی اور ہمدردی ہوتی ہے، بڑی مقدّس بے اطمینانی ہوتی ہے۔ دُور رس اور ہمہ گیر سماجی تبدیلیوں کا شریفانہ مطالبہ ہوتا ہے۔ دُوسرے شعرا ایسے موقعوں پر غوغا آرائی کرتے ہیں۔ مگر ساغر صاحب کا احساس انہیں یہ لہجہ اختیار کرنے پر اُکساتا ہے ؎

اور اب ہر طرف اندھیرا ہے　　　ہر طرف اک جمُود، سنّاٹا

جیسے ہو زندگی شبِ دیجور

کاش ہر شخص کا ضمیر اُسے
اس اندھیرے میں سیدھی راہ دکھائے

فکرِ تازہ کی رہنما کوئی لہر
ذہنِ گمراہ و قلبِ ویراں میں

اک نئی رُوحِ آگہی بھر دے

شمعِ احساس کا کوئی پرتَو
دلِ پژمُردہ و حراساں میں

اک نیا عزمِ زندگی بھر دے

آتشِ شوق کا کوئی شعلہ
رُوحِ ویران و سَرد و جامد کو

پھر نئی آرزُو سے گرما دے

ایک اور خطرناک مرحلہ دیکھئے جہاں ساغرؔ صاحب کے علاوہ کوئی دُوسرا فنکار آسانی سے غیرِ انسانی طلنطنے کا شکار ہو سکتا تھا ــــ

ہے جہاں نابرابری کی وَبا
بے کسی اور بے لَبسی کی وَبا

جہاں فاقہ غذائے انساں ہے
بے زری دولتِ غریباں ہے

چشمِ مفلس ہے کاسہ لیس جہاں
جس جگہ ہر نظر بھکاری ہے

باربردارِ قحط ہے انساں
زیست افلاس کی سواری ہے

گر نمی ہے تو چشمِ دہقاں میں
ورنہ ہر سمت خشک سالی ہے

صرف بنجر نہیں زمیں ہی جہاں — دل بھی بنجر ہے رُوح بھی بنجر

ایسی بے برگ و بار دھرتی میں — نخلِ جمہُوریت کا پنپا ہے؟

پھُول جمہُوریت کا مہکا ہے؟

یہ زمیں مانگتی ہے خونِ جگر

کیا تجھے ذوقِ آبیاری ہے؟

یہ ایسے مقامات ہیں جہاں بالعموم اُردُو شعرا خطیبانہ تردید (Declaimation) کا انداز اختیار کر کے خود اپنی اور شاعری کی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔ اور اگر خراب نہیں کرتے تو اُسے مشکوک ضرور بنا لیتے ہیں۔ اچھی اور بڑی نثر کی طرح اچھی اور بڑی شاعری میں خطابت کی فراوانی مناسب نہیں ہوتی۔ خطابت اور شعر کے تخلیقی عمل میں بہت بڑا فرق ہے مشہُور انگریزی شاعر (W. B. Yeats) نے ایک مرتبہ بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ جب ہم دُوسروں سے لڑتے ہیں تو خطابت جنم لیتی ہے اور جب خود اپنے وجوُد سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو شاعری!

ساغر صاحب کی اس نظم میں شعری عمل تخلیقی ہے اور تکذیبی احتجاج سے بڑی حد تک پاک۔ ہر قدم پر نظریاتی خلوص اور پنڈت نہرُو کی شخصیت اور اصُولوں سے کامل مطابقت اور اِس سے کہیں زیادہ فنّی شعور اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔ ساغر صاحب شعریات کے اس نکتے

سے آگاہ ہیں کہ صراحت اور براہِ راست اظہار کے مقابلے میں ایمائی اور اشاراتی طرزِ بیان زیادہ پائدار اور ادبی وقار و وقعت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اقبالؔ کے اس خیال سے متفق ہیں کہ

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست

اسی ادبی مسلک کی وجہ سے اس نظم میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری ہے جو اُسے وقتی ادب (Period Literature) ہونے سے ہر مرحلے پر بچاتی ہے اور یہ نظم پنڈت نہرُو سے متعلق ہوتے ہوئے بھی اُن کی مادّی شخصیت سے ماورا، یا بلند ہو کر ان کی فکر کی بے کراں وسعتوں کے وسیلے سے بڑی سچائیوں پر کمندیں ڈالتی ہے۔ یہ نظم جہاں ایک طرف ہماری قومی زندگی کا "رزم نامہ" ہے وہیں دُوسری طرف ہماری تہذیب کی وجدانی لطافتوں کی غزل بھی ہے۔

جہاں ایک طرف حال کے دل خراش مرحلوں کی مظہر ہے وہیں دُوسری طرف مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔ نہرُو نامہ اپنی حسّی فضا کے اعتبار سے قومی ہے مگر فکری وسعتوں کے لحاظ سے بین الاقوامی۔ بالکل نہرُو کے نقطۂ نظر کی طرح۔

اگرچہ یہ نظم پنڈت نہرُو کی موت پر لکھی گئی ہے مگر میرے خیال میں یہ موت سے کہیں زیادہ زندگی کی نظم ہے۔ اور پھر ہم نہرُو کو یا کسی اور کو اُس کی موت سے نہیں، زندگی سے جانتے ہیں۔ نہرُو تو متحرّک اور ہر لمحہ رواں دواں زندگی کی علامت تھے۔ اُنہیں زندگی سے محبّت تھی۔

اُسے سنوارنے اور نکھارنے کی آرزو تھی۔ وہ کبھی "مستئ اندیشہ ہائے افلاکی" میں گرفتار نہیں ہوئے۔ زمین کے ہنگاموں سے قریب رہے اور ان ہنگاموں سے دست و گریباں ہونے کا پیام دیتے رہے۔ اُن کے مزاج میں وہ مقدس ارضیّت تھی جس پر ماورائی طرزِ فکر رکھنے والوں کے تصوّر کی ہزاروں جنّتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ان کی مادیّت میں اُنیسویں صدی کے سائینس دانوں کی بے رحم خشونت نہیں۔ بلکہ تخیّل آمیز لطافت ہے۔ اُن کی شخصیّت کے اس پہلو کو ساغرؔ صاحب نے اچھی طرح سمجھا اور اپنے احساس میں اچھی طرح رچایا بسایا ہے۔ اگر وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کرتے تو اُن کے لئے اتنی کامیاب نظم کی تخلیق ممکن نہ ہوتی۔

آج تک خالص مادّی اقدار کی حامل شخصیّات پر کامیاب اور بڑی نظمیں نہیں لکھی گئی ہیں۔ مجھے نیوٹن۔ ڈارون اور کارل مارکس پر آج تک کوئی نظم ایسی نہیں ملی جو مکمل فنّی لطافتوں کی حامل ہو۔

میں نے ابھی نہرو نامہ کو زندگی کی نظم کہا ہے، اس بات کی تصدیق اس نظم کی مجموعی فضا سے ہو سکتی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف وہ علامتیں اور پیکر بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں جو اس نظم میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اس نظم کے بیشتر پیکر زندگی کے نگار خانے کے پیکر ہیں۔ اور موت و شکست کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا گیا ہے، وہ

حیات بخش ہے۔

نظم میں ایک جگہ موت کے فرشتے کے لئے "سیہ رُو فرشتگانِ فنا" کی تمثال استعمال کی گئی ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف موت سے نفرت کا اظہار ہے، وہیں دُوسری طرف "حجلۂ یاسمن" میں سنورتی ہوئی زندگی کی صباحت کا بھی ادّعا ہے۔ نہرُو نامہ زندگی کے جمال و جلال کا آئینہ خانہ ہے۔ تسلسلِ حیات کے فلسفے کے پس منظر میں نہرُو کی موت کا جائزہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قنوطیت، پسپائی، شکست خوردگی اور ایسے ہی دُوسرے متشائم احساسات اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تسلسلِ حیات کے اس فلسفے پر برگساں کے تخلیقی ارتقاء (Creative Evolution) اور اس کی قوتِ محرّکہ (Elan Vital) کی چھاپ نمایاں ہے۔ مگر اس فلسفے کا شعری اظہار اقبالؔ کے "ساقی نامہ" کے بعد صرف اس نظم میں ممکن ہو سکا ہے۔ اس فلسفے اور اس کے مضمرات کو جو شعری لباس ساغرؔ صاحب نے عطا کیا ہے اس کے چند نقوش آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

نو بہ نو اک نمُود، اک تحلیل — نو بہ نو اک طلوع ایک غرُوب

نو بہ نو اک شگفتنِ پیہم — نو بہ نو اک فسُردگی کا غبار

نو بہ نو اک شکست ایک ظفر — ہر نفس تیغ ہر نفس ہے سپر

نو بہ نو اک مسرّتِ فانی — ہر نفس اک نمُودِ رنجِ دوام

اک تماشائے ہست وبُود مدام

ہو رہا ہے ازل سے دُنیا میں موت اور زندگی کا رقصِ دوام
ایک گیسُو کے پیچ وخم میں نہاں لاکھ آرائشِ خمِ گیسُو
اور تہذیبِ ہر خمِ گیسُو سونئے پیچ وخم کا ساماں ہے
نو بہ نو پیکروں کا اک طُوفاں تازہ دم منظروں کا ایک ہجُوم
ہر سحر نیم وَا کلی کی ہے سیج اور ہر شام اک جنازۂ گُل
ہر شبِ ماہ خوابگاہِ گلاب

اک ستارہ جو ڈُوب جاتا ہے اس کے مرقد کے گھور اندھیرے سے
سو ستارے طلُوع ہوتے ہیں

جام میں ایک بال پڑتے ہی چاک سے لاکھ جام اُبھرتے ہیں
اور ہر دورِ جام میں پنہاں ایک طُوفانِ گریہ و ماتم
اور جو دیکھا تو چند لمحوں میں بزمِ ماتم پہ خندہ زن ہے نشاط
پھر وہی دورِ جام ورقصِ نگار

تسلسُلِ حیات کے فلسفے کے اس پس منظر میں نہرُو کی موت اور زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ تسلسُلِ حیات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھے اور حیات کے تسلسُل کے ساتھ ان کے آدرش آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتے رہیں گے اور ان کا مقدّر سنوارتے رہیں گے۔ اس فلسفے کی رُو سے انفرادی وجُود فنا پذیر ہے مگر نوعی وجود باقی رہتا ہے۔ چونکہ نہرُو اس نوعی وجود کی علامت تھے۔ اس لئے "سیہ رُو فرشتگانِ فنا" کے سرِ دہات اُن کے آدرشوں کو نہیں چھُو سکتے۔

یہ ہے اس نظم کی شعری اور فلسفیانہ منطق۔ اور اس بنیادی فلسفے کو ذہن نشین کئے بغیر اس نظم کا مطالعہ نامکمل رہیگا۔ اس فلسفے کے فنّی پہلو پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے اس فلسفے نے نظم کے شعری امکانات کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اور ان فنّی امکانات کی تکمیل ساغرؔ صاحب ہی کے بس کی بات تھی۔

ساغرؔ صاحب ہمارے اُن چند شعرا میں ہیں جو کسی مسئلے پر دیر تک اور دُور تک سوچ سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور پر قسطوں میں سوچا گیا ہے اور لکھا بھی گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے یہاں چند طویل نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اور جو لکھی بھی گئی ہیں اُن میں اندازِ بیان کی شدید ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری اکثر طویل نظمیں دو ایک مصرعوں کی انگنی پر لٹکی ہوئی محسُوس ہوتی ہیں۔ نہرُو نامہ میں آپ کو حُسنِ بیان کی ناہمواری اور غربت کا کہیں بھی احساس نہ ہوگا۔ اگرچہ اس نظم میں کئی اسالیبِ اظہار موجُود ہیں۔ کہیں متفکرانہ دھیما پن ہے۔ کہیں

خود کلامی ہے۔ کہیں ڈرامائی اظہار ہے اور کہیں غنائیت کی نرم رَوی ہے اور کہیں زندگی کی موج دَر موج حرکت کا تیز رَو بیان۔

ان سب اسالیب کا ساغرؔ صاحب نے حق ادا کیا ہے۔ ہر جگہ حُسن کی سلامت رَوی قائم ہے اور ہر مرحلے پر ساغرؔ صاحب کا شاداب اور خلّاق تخیّل نو بہ نو پیکروں کے ایک ہجُوم کے ساتھ سامنے آتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک باشعُور فنکار ہیں اور ولیم موری (William Morris) کی طرح جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری میں الہام کا عنصر کم ہوتا ہے اور فنّی ریاضت اور مجاہدے کا زیادہ'

'نہرُو نامہ' روایتی انداز کا نہ تو نوحہ ہے اور نہ ہی مرثیہ۔ اسے تو میں ایک پُردرد رزمیہ کہوں گا ہندوستان کی ثقافت کا۔ ایسی ہندوستانی ثقافت جس پر صدیوں سے بین الاقوامی تہذیبوں کے جلال وجمال کا پرتو محسوس طور پر موجود رہا ہے۔ نہرو نے اپنے بھرپور تاریخی شعور کی مدد سے اس ہمہ رنگ ثقافت کے نقش اُبھارے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ ثقافت ان کے فکر و احساس کی شاہراہوں پر پُورے تسلسُل کے ساتھ رواں رہی ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف قبل تاریخ کے انسان کی اساطیری شادابی اور ابہام کے نقش ملتے ہیں، وہیں دُوسری طرف جدید صنعتی دَور کے انسان کے ذہن کی معرُوضیّت اور وضاحت کی بھی جلوہ گری ہے اچھے ادب کی طرح صحت مند اور صالح تہذیبیں بھی آوازِ بازگشت کے سلسلے کا

دُوسرا نام ہوتی ہیں۔ جواہر لعل اس نکتے سے اچھی طرح واقف تھے کہ جدید تہذیب کو برقرار رکھنے کے لئے وضاحت اور معرُوضیّت کے ساتھ ساتھ قدیم تہذیب کے سرمائے کے افسانہ و افسوں کی فضا سے بھی ہم آہنگ رہنا ضرُوری ہے۔ ساغر صاحب نے پنڈت نہرُو کے تہذیبی شعُور کے اس رجحان کو پہلی مرتبہ اپنی گرفت میں لیا اور پھر اپنے خلّاق تخیّل اور فنکارانہ مہارت کی مدد سے نہرُو نامے کو عالمی ثقافت کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ یہ کام کس قدر دشوار ہے اسے وہی لوگ جانتے ہیں جن کی نظریں ؎

ستارہ می شِکنند آفتاب می سازند

کے عمل پر ایک عرصے تک مرکوز رہی ہوں۔

اس نظم کی ترتیب و تزئین میں رومیوں کے ذہن کی وضاحت، یُونانیوں کے پُر جمال ابہام اور مُغلوں کے احساسِ تعمیر کے نقوش، قدم قدم پر محسُوس ہوتے ہیں۔

کسی بڑی شخصیّت پر یہ اردُو کی پہلی بڑی نظم ہے۔

مخمورؔ جالندھری

نویدِ فردا

نہرو نامہ — ایک رزمیّہ ہے جو انسانی فہم و ادراک کے ارتقاء کا پیمانہ ہے ساغر نظامی نے اپنی اس نظم میں ہیئت و موضوع اور تکنیک و فن کا دلآویز اور پائیدار تجربہ کرتے ہوئے اسے جامِ جہاں نما ہی نہیں بلکہ خورشیدِ کائنات افروز بنایا ہے۔

اس نظم کے مربوط، منضبط اور ہم آہنگ تسلسل میں پنڈت نہرو کے وہ خدوخال اُجاگر ہوتے ہیں جن سے اُن کے رُوحانی وجود کا قامت زیادہ بلند، زیادہ عظیم اور زیادہ حسین و جمیل ہو جاتا ہے۔ ساغر نظامی کی اس نظم میں پنڈت نہرو عالم کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کا آدرش ہیں، انسان کو نئی عظمتوں سے سرشار کرنے کا تصوّر ہیں اور نئے جذبۂ تعمیر کا ایقان ہیں۔

نہرو نامہ — ساغر کی نصف صدی سے بھی زائد باقاعدہ شاعرانہ ریاضت، فکر و خیال شعور و آگہی پر مسلسل جِلا، ذہن و دل کی ابتلا اور بے کلی، دردمندی و آرزومندی، محرومی و

کامرانی کے بے پایاں تجربے، زندگی کی منفی قدروں، فرسودہ روایتوں اور رجعت پرست قوتوں کی تخریب و غارت گری پر ایک فنکار کے مثبت جلال کا صحیفہ ہے۔

ایک عظیم شخصیّت کو شعریّت کا پیکر عطا کرنے کے لئے رنج و مسرت، اضطراب و طمانیّت اور نشاط و الم سے نکھارے ہوئے جس گہرے احساس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس نظم میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک عظیم شخصیّت کا احاطہ کرنے کے لئے شاعر کی اپنی آغوشِ نظر اس قدر وا ہونی چاہیئے کہ وہ شخصیّت اپنے لامحدود اوصاف کے ساتھ اُس میں سما سکے۔ نہرو نامہ ساغر کی بے کنار آغوشِ نظر ہے۔

کسی فرد پر نظم کہتے ہوئے سب سے ٹیڑھا مسئلہ جو رونما ہوتا ہے وہ قطع و بُرید، ترمیم و اضافہ اور امتیاز و انتخاب کا مسئلہ ہے کہ اُس کی شخصیّت کے کن پہلوؤں کو موضوعِ شعر بنایا جائے، کن پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ قطع و برید اور انتخاب کا یہ عمل شاعر کی اپنی بلندئ فکر اور پُختگئ شعور کا غمّاز ہوتا ہے۔ ساغر کا یہ فن پارہ اُس کے حُسنِ انتخاب کا آئینہ دار ہے۔ شاعر کو یہ نظر اور یہ بصارت اتفاقیہ میسّر نہیں آتی۔ اُسے اچانک کوئی الہام نہیں ہوتا یہ نظر اور یہ بصارت اس کے اپنے ظاہر و باطن کی برسوں سے جاری آبیاری کا ثمر ہوتی ہے۔ ساغر نے پنڈت نہرو پر نظم اس لئے کہی کہ اُس نے پنڈت جی میں اپنے ہی تصوّر کی تجسیم دیکھی اور اپنی ہی نوا پائی۔ پنڈت نہرو سے ساغر کی جذباتی یگانگت اور تخیلی قربت نے نہرو نامہ کا

رُوپ دھارا ہے جو بیک وقت نہرُو اور ساغر کی آواز ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ساغر نے اس آواز کو اپنے شاعرانہ کمال اور ذہنی کاوش سے نویدِ فردا بنا دیا ہے ۔

نہرُو نامہ کا فنّی کمال یہ ہے کہ اس میں زیبِ داستاں کے لئے افراط و تفریط کا استعمال کہیں بھی نہیں ہوا ہے ۔ اس میں زندگی کے اُن حقائق سے بحث کی گئی ہے جو بجائے خود تاثّر کے حامل ہیں ۔ یعنی اس نظم کے حصار میں سائینس، فلسفہ اور منطق کے وہ مسائل ہیں جن پر انسان صدیوں سے دماغ سوزی کرتا آرہا ہے اور جن میں اپنی فراست و ذہانت سے قابلِ قدر اضافے کرتا ہوا اس دُنیا کو فردوس بریں بنانے کی جد و جہد کر رہا ہے ۔ حکمتِ مرگ و زیست، حُسن، خیر، حق، امن، ماضی، جمہوریت، سوشلزم اور لادینیت سے پنڈت نہرُو کا جو پیکر بنایا گیا ہے وہ مستقبل کے انسان کا پیکر ہے ۔ ایک ایسا پیکر جو صحت مند روایت ہے ۔ جو انسانیت کے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے اور جو تسخیرِ کائنات کی آرزو ہے ۔

نہرُو نامہ میں ایسی ہی رجائیت کی نکہتیں ہیں ۔

پھر یہ جولانگہِ فنا و بقا — نئے جلووں سے جگمگائے گی
زندگی پھر نئے جمال کے ساتھ — ذرّے ذرّے سے مُسکرائے گی
سر جُھکا کر ادب کے ساتھ اُسے — وقت پھر تحفۂ بقا دے گا

اک نئی نذرِ ارتقا دے گا !

کل طلوعِ بہار پھر ہوگا　　جس جگہ آج شورِ ماتم ہے
اُس جگہ نغمہ زار پھر ہوگا

○

نہرُو نامہ —— عالمی ثقافتوں اور تہذیبوں کا امتزاج ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ثقافت کا مرقّع ہے۔ ساغرؔ نے وطنیّت کی حدیں پھیلا کر اِس دُنیا تک ہی محدُود نہیں رکھیں بلکہ ستاروں کی نئی دنیاؤں تک پھیلا دی ہیں۔ اُس نے پُوری کائنات کو اپنے تخیّل میں سمیٹ کر نہرُو نامہ کی تخلیق کی ہے اور حق تو یہ ہے کہ نظم لکھنے کا حق ادا کیا ہے کیونکہ اتنی آفاقیت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی گہرائی و گیرائی شاید ہی اُردو کی کسی اور نظم میں ہو۔ ساغرؔ نے پنڈت نہرُو کو، جو ایک ترقی یافتہ فلسفہ تھے اور ایک حقیقت تھے، ساری کائنات پر پرتو فگن کر دیا ہے۔

ساغرؔ کی نظر نے ایک اینلارجر (Enlarger) کا کام کیا ہے جو مُنحنی نقوش کو اتنا بڑا بنا دیتا ہے کہ اُن کی تمام قوسیں، تمام خطوط اور تمام فراز نمایاں ہو جاتے ہیں۔

نہرُو نامہ میں ایک اور بہت ہی حسین التزام ملتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں، شیرینیاں، پیچیدگیاں اور نُزہتیں پہلُو بہ پہلُو اور دوش بہ دوش ملتی ہیں۔ اس میں غم و یاس کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں ایک سُلگتے ہوئے غم کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُمید و امکان کی دھاریاں ایک

کھلی ہُوئی دھنک نظر آتی ہیں۔ اس نظم کی ترکیب و ترتیب سے بھی شاعر کی وسیع النظری اور اپنے فن پر دسترس کامل نمایاں ہے۔ ہمارے سامنے ایسے واقعات اور مناظر پر سے پردہ اُٹھتا ہے کہ ان میں تصوّر و حقیقت، ماضی و حال اور مستقبل بغلگیر نظر آتے ہیں۔ زمان و مکاں کی قید ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

نہرُو نامہ —— ایک جہدِ مسلسل اور ایک کاوشِ پیہم کی داستان ہے۔ اِس میں رُوحِ شاعر اُن قوتوں سے نبرد آزما ہے جنہوں نے دنیا کو جولانگہِ رنج و محن اور انسان کو مجموعۂ آہ و بکا بنا رکھا ہے۔ یہ نظم دلِ شاعر کے اُس درد سے شرابور ہے جسے دردِ آگہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ دردِ آگہی ایک عظیم شاعر کا ہی مقدّر اور حصّہ ہوتا ہے۔ جب یہ درد شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے تو پیغام اور بشارت بن جاتا ہے۔

ساغرؔ کے پہلے مجموعۂ کلام بادۂ مشرق (۱۹۳۵ء) سے جس درد کی دبی دبی کسک کا آغاز ہوا تھا اُس کا تکملہ نہرُو نامہ ہے۔ اس سے ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ساغرؔ راہِ مستقیم سے کبھی ڈگمگایا نہیں۔ بہت کم شاعر عصرِ نو کا ساتھ دیتے ہیں یا اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اُن کی اپنی زندگی ہی میں اُن کا شمار قدماء میں ہونے لگتا ہے مگر ساغرؔ آج سے پچاس سال پہلے کی نئی نسل کا شاعر تھا اور آج کے جدید شاعروں کی نئی نسل کا بھی شاعر ہے کیونکہ اُس نے اپنے فنِ شعر میں ارتقاء کا عمل ہمیشہ جاری رکھا۔ اپنی زبان اور اپنے شاعرانہ

لب ولہجہ کو جدّت واختراع کا حامل بناتا رہا اور اپنے منفرد اسلوب پر صیقل کرتا رہا۔

ساؔغر کی یہ نظم ایک طرزِ حیات ہے۔ ایک سفرِ مستقبل ہے جس میں موت منزلِ آخری نہیں، بلکہ رحیلِ کارواں ہے۔ اس میں زندگی کو نیا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس میں زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ جس میں ایک فرد اگر زندگی کے آنچل میں چند ستارے ٹانک کر چلا جاتا ہے تو اُس کے رفیق وہ آنچل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اس کے لئے نئے ستاروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ساؔغر کی یہ نظم ایک مستقل تلاش، ایک مسلسل جُستجو ہے۔

نہرُو نامہ ہر اعتبار سے عہد آفریں شہ پارہ ہے اور اُردو شعر وادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

بلراج کومل

نوائے جاوداں

'نہرو نامہ' جناب ساغر نظامی کا تازہ ترین ادبی شاہکار ہے۔ اس طویل نظم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ موت اور زندگی ایک مسلسل عمل ہے۔ انسان کا وجود در حقیقت رُوحانی وجود ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسانیت کی عظیم قدروں کا عکس نظر آتا ہے پنڈت جواہر لعل نہرو کی زندگی اور موت کا تعلق اسی رُوحانی وجود سے ہے۔ وہ عظیم قدریں جن کے لئے پنڈت جواہر لعل نہرو زندہ رہے، ان کی موت کے بعد اس رُوحانی وجود کا حصّہ بن گئی ہیں جو جاوداں ہے، مرگ وحیات سے ماورائے ہے۔

ہندوستانی تہذیب وثقافت سے دلچسپی اور محبّت کا اظہار کرنے والے لوگوں میں ہمیں عام طور پر دو قسم کے رویّے نظر آتے ہیں۔ حسن ماضی کی تجدید کا رویّہ یا ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ کو تحقیر آمیز انداز سے دیکھنے کا رویّہ۔ پہلے رویّہ کی تہہ

میں حال کے مسائل سے بے رُخی اور ماضی کے ساتھ مریضانہ دلچسپی کے جذبات کارفرما ہیں۔ دُوسرا رویّہ تاریخ کے نامکمل شعوُر کی پیداوار ہے اور اس کی حیثیت فیشن پرستی سے زیادہ نہیں۔ درحقیقت یہ دونوں رویے بنیادی طور پر غلط ہیں۔

ساغر نظامی نے 'نہرُونامہ' میں ایک تیسرا رویّہ پیش کیا ہے۔ یہ رویّہ زندہ انسانوں سے دلچسپی کا رویّہ ہے۔ ان کے جذبات واحساسات، ان کے مسائل کو تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں سمجھنے کا رویّہ ہے۔ اس رویّے کا ایک قابلِ ذکر پہلوُ یہ ہے کہ ساغر نظامی ہندوستانی ثقافت اور تہذیب کا کوئی خالص اور مطلق تصوّر پیش نہیں کرتے، بلکہ تمام زندہ اقدار کا جائزہ عالمی محرّکات کی روشنی میں لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا مثبت اندازِ نظر، ان کی کشادہ دلی، ان کی وسیع النظری اس عظیم شخصیّت کے محاسن سے مشابہ ہے جس کا رُوحانی کردار وہ 'نہرُونامہ' میں پیش کرتے ہیں۔

کسی فن پارے کو شعر کی سطح تک اُوپر اُٹھانے کے لئے بہت سی قابلیّتوں کی ضرُورت ہوتی ہے۔ بعض شاعر زندگی کی کھُردری حقیقتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے خالص شعر کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ دُوسرے فنِّ شعرگری کے پُرپیچ راستوں میں گمُ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ساغر نظامی اگرچہ اظہار و بیان پر مسلّمہ قدُرت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ محض فنِّ شعرگری اور کاریگری کے شاعر نہیں ہیں بلکہ زندگی کی کھُردری حقیقتوں کے

شاعر ہیں جنہیں وہ اپنے تخیّل، اپنے اندازِ نظر اور اپنی ریاضت سے عظیم جذباتی ارتفاع سے آشنا کرتے ہیں۔ ان کے ساحرانہ لمس سے یہ کھُردری حقیقتیں حسین اور جاذبِ نظر حقیقتیں بن جاتی ہیں

ہمارے دور کی سب سے بڑی مُصیبت وہ روحانی بُحران ہے جس کی زد میں دورِ جدید کے کم و بیش سبھی دانشور، شاعر اور ادیب آچکے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ اس روحانی بُحران ہی کو جدید ذہن کا طرۂ امتیاز قرار دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے دور میں دو عظیم جنگوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی لیکن خطرناک جنگیں ہوئی ہیں۔ لاکھوں کروڑوں معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ہے اور عذاب و ستم اور ظلم و تشدّد کی ایک ہولناک داستان ہمارے سامنے ہمارے ہی خُون سے لکھی گئی ہے۔ اس جان لیوا، ایمان شکن دور میں کتنے لوگ ہیں جو اپنا ذہنی توازُن برقرار رکھ سکے ہیں۔ ہمارے سامنے اقدار کا بے برگ و بار دشت ہے کھنڈر ہیں اور ریت کے طوفان ہیں۔ یہ ہمارے دور کے سنگین حقائق ہیں۔ ان سے مفر ممکن نہیں ہے

ساغر نظامی کو اِن حقائق کا شعور ہے۔ وہ ان حقائق کے سبھی پہلوؤں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ اقدار کے منہدم ہونے کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کرب کا اظہار کرتے ہیں جو اِس عمل کی وجہ سے اُن کے ذہن و دل میں پیدا ہوتا ہے لیکن کرب کا اظہار کرنا

بذاتِ خود بہت بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ ساغر نظامی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ وہ اظہارِ کرب کے علاوہ اظہارِ ایمان کرتے ہیں۔ اظہارِ کرب صرف دورِ جدید کے دانشوروں کا شیوہ ہے اظہارِ ایمان صرف وہ شاعر کر سکتا ہے جو وقت کو چھوٹے چھوٹے محدود ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ مرگ وحیات، زمان ومکان کا ہمہ گیر فنکارانہ تصوّر رکھتا ہے۔ اور اس تصوّر کے واسطے سے انسانی زندگی، انسانی رشتوں اور انسانی قدروں کا محاکمہ کرتا ہے

اگر 'نہرو نامہ' کی تخلیق میں یہ ہمہ گیر تصوّر کارفرما نہ ہوتا تو 'نہرو نامہ' صرف ایک سوانح بن کر رہ جاتا۔ یا صرف پنڈت جواہر لعل نہرو کی موت کا نوحہ بن جاتا جس کی قابلِ ذکر خصوصیات یا تو اس کی تفصیلات ہوتیں یا اس کی جذباتیت

شخصی غم اور شخصی عقیدت بڑے قابلِ قدر جذبات ہیں۔ 'نہرو نامہ' میں ان جذبات کا پُرخلوص وفور ہے۔ یہ غم اور عقیدت صرف ساغر نظامی کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری ہندوستانی قوم پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی اور موت کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ساغر نظامی نے اپنا ذاتی ردِّ عمل قومی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس لئے وہ بے جان تفصیلات پیش کرنے اور کھوکھلی جذباتیت کا اظہار کرنے کی بجائے قدروں کے اُس عظیم عمل کو پیش کرتے ہیں جو انسانی تاریخ میں ازل سے ابد تک جاری وساری ہے۔ 'نہرو' ان کے ہاں محض ایک فرد کی حیثیت نہیں

دکھتا۔ ایک شعور ہے، ایک سلسلہ ہے جس کی تجدید ہر دَور میں ہوتی رہے گی

جب بھی کشتی بھنور میں آئیگی

نہرُو آئے گا ناخُدا بن کر

○

ماہ کی طرح چھُپ گیا ہے وہ

لیکن ایوانِ شب کے پردوں سے

ماہ کی طرح پھر عیاں ہو گا

○

'نہرو نامہ' ایک متحرّک فلسفہ کی پیداوار ہے، ماضی کا ورثۂ عظیم ہے لیکن اس کو قدرِ مطلق تسلیم کرنا ذہن کی موت ہے۔ حال زندہ حقیقت ہے اور اُس سے زندہ ترین حقیقت مستقبل ہے۔ تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری ہے لیکن انسان کی عظیم ترین خواہش بہتر زندگی اور مسرّت کی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے مسلسل عمل اور مسلسل جدو جہد کی ضرورت ہے

ساغرؔ نظامی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دَورِ جدید کی رُوحانی ظلمت میں تحرّک عمل اور ایمان کی شمع روشن کی ہے

یہ تحرّک، عمل اور ایمان پنڈت جواہر لعل نہرو کی عظیم شخصیت کا طرّۂ امتیاز تھا۔
یہ تحرّک عمل اور ایمان ساغرؔ نظامی کے عظیم اور منفرد شعری احساس کی پہچان ہے
'نہرو نامہ' اِس تحرّک، عمل اور ایمان کی فنکارانہ تصدیق پیش کرتا ہے

مُنکروں کے ہجُوم میں تنہا
رُوحِ ایمان تھا یہ کیا کم تھا
عہدِ حاضر کا دیوتا ہو کر
صرف انسان تھا یہ کیا کم تھا

•

۳ر جولائی ۱۹۶۷ء

نئی دہلی

ذکیہ سُلطانہ نیّر

قدروں کا شہر آشوب

محبّت کسی نہ کسی کی ذات ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن ذات سے محبّت کرنا دھوپ چھاؤں سے محبت کرنا ہے۔ قائم رہنے والی تو ہے ذہنی محبّت۔ پُرانے زمانوں میں ذات سے محبّت پہاڑ سے جُوئے شیر نکالتی تھی۔ آج تو برف کا ایک ٹکڑا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پگھل جاتا ہے۔

آئے دن محبُوب سے محبُوب تر افراد مرتے ہیں جنہیں خاک میں دبا یا آگ میں جلا کر کوئی دو دن بھی نہیں روتا۔ لیکن جن سے ذہنی ربط ہوتا ہے، جو ہم مقصد ہوتے ہیں، ہم مشرب ہوتے ہیں، جن کے درمیان کچھ قدریں مشترک ہوتی ہیں، انہیں دل عمر بھر روتا ہے، اُن کی یاد سے غم خانۂ جاں کبھی خالی نہیں ہوتا، ان کی یاد سے زندگی کا نیا سرچشمہ پھوٹتا ہے

پنڈت جواہر لال نہرُو کی یاد سے زندگی کا جو نیا سرچشمہ پھُوٹا اس کا نام 'نہرُو نامہ' ہے

ذاتی تعلقات بڑی چیز ہیں مگر اس کی کیا ضمانت کہ یہ کسی بڑی تخلیق کے لئے محرّک بھی ہو

سکتے ہیں، خاص کر ایسی حالت میں جبکہ تعلقات کے حدود اور اقدار فنکار کے ذہن و خیال

میں پہلے ہی سے معیّن ہوں

ساؔغر صاحب کو پچھلے ۲۴ برسوں میں، ایک شوہر نہیں، دوست کی حیثیت سے جتنا

میں نے سمجھا اور جانا ہے، جتنے فسانے اور جتنی حقیقتیں میرے سامنے اُبھری اور بکھری ہیں

اُن میں سے دو کو میں کبھی نہیں بھلا سکتی

(۱) ساؔغر نے ساری عمر جنگِ آزادی کو اپنے نغموں سے گرم رکھا۔ پتھروں، چاقوؤں

اور گولیوں کی بارش میں وہ آزادی کے ہر محاذ پر آگے آگے رہے۔ قوم وملک کی راہ میں سخت سے

سخت تکلیفیں اُٹھائیں، شدائد کو مسکرا کر سہا، آلام پر فخر کیا مگر آزادی ملنے کے بعد وہ اپنے

پُرانے مربّی اور ساتھی جواہر لال اور ابوالکلام آزؔاد سے چھ سال تک ملے بھی نہیں، اور اپنے

ادبی مشاغل میں مصرُوف رہے

(۲) شادی کے بعد بمبئی (۱۹۴۴ء) میں مادام صوفیہ واڈیا کی کوٹھی پر ہمارے خیر مقدم

میں ایک جلسہ ہوا۔ سروجنی دیوی اُٹھیں اور میرے سر پر ہات رکھ کر کہا

دیکھو میری بہُو کو۔ یہ کتنی پیاری ہے لیکن اس پیاری بہُو نے مجھ سے میرے

بیٹے (ساؔغر) کو چھین لیا ہے

یہ تھی ساؔغر سے اُس عظیم خاتون کی محبّت جو دیوی ہی نہیں تھی انسانیّت کے باغ کی

کوئل بھی تھی اور جب یہ کوئل یُو۔پی کی گورنر بنا دی گئی تو ساؔغر سخت سے سخت موسم میں بھی
اپنی ماں سے اپنے دُکھ کا اظہار کرنے نہ گئے

ساؔغر ایک خُودار انسان ہیں جیسا کہ ہر انسان کو ہونا چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہر انسان کو حلیمی کے ساتھ اپنی خُودی کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ جو شخص "حاصل" کا تصور نہیں رکھتا وہ انسانی شرف کو باقی رکھ سکتا ہے اور انسانی شرف کو باقی رکھنا رُوحانی سکون کے حصُول کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔"

مجھے یاد ہے جب ہم ۱۹۵۷ء میں ساؤتھ ایونیوئ دہلی میں رہتے تھے تو میں بچّوں کو لے کر پنڈت جی کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوا کرتی تھی۔ تو وہ مجھ سے پوچھتے 'ساؔغر صاحب کہاں ہیں ؟ اچھی طرح تو ہیں ؟' اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی، جواب کیا دیتی سوائے جھُوٹ بولنے کے کہ وہ باہر گئے ہیں۔ حالانکہ وہ گھر پر ہوتے تھے

جاننے والے جانتے ہیں کہ فلیٹ نمبر ۱۳۶ وزیرِاعظم کی کوٹھی سے محض سو قدم پر ہے

اب تو ساؔغر زندگی کے خارزار کو طے کر چکے ہیں۔ ان کا یہ کردار اُس وقت تھا جب جہدِ حیات کا اتھاہ ریگستان تھا اور وہ

ساؔغر کی خُودی ایک مفکّر اور ذی شعور فنکار کی خُودی ہے۔ ساؔغر نے بہت جلد سماج کے ہر عنصر کو پرکھ لیا۔ ادبی، سیاسی، تجارتی، عوامی ہر گوشے کا جائزہ لے لیا۔ اُس نے شاعر

کا 'مقامِ بے مقام' معلوم کر لیا، اس نے اربابِ سیاست کی بے حسی، بے ذوقی، تہی مائیگی اور افلاس و بے چارگی کو ایک نظر میں بھانپ لیا، جو سمجھ گیا کہ یہاں جوہر تو ہے جوہری نہیں ادبی ہنگامے محض مسخرگی ہیں اور شاعری لالۂ صحرا کی طرح ویرانوں میں اُگ رہی ہے

ساغرؔ نے زبان و ادب کی کسمپرسی، کم مائیگی، مسخرگی، تشنگی، گرسنگی اور موت! سب کا اندازہ لگا لیا۔ انہیں عرفان ہو گیا کہ وہ خوابوں کے کھنڈروں میں اکیلے! تنِ تنہا کھڑے ہیں اور ہر طرف سنّاٹا ہے

اسی سنّاٹے میں جواہر لال نے دم توڑا۔ موت کو فطری کہا جاتا ہے۔ بیشک ہوتی بھی ہے۔ لیکن موت کے کچھ اور بھی اسباب ہوتے ہیں۔ موت دِل کے چُور چُور ہو جانے کا نام ہے۔ موت شدّتِ احساس سے مغلوب ہونے کو کہتے ہیں۔ موت احساس کی ضربوں سے اعصاب کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟

جیسے ہی جواہر لال کی چِتا کے شعلے بلند ہوئے، ساغرؔ کا احساس بھی شعلہ بن کے لپکا اور وہ موت اور رجعت دونوں سے انتقام لینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ 'نہرو نامہ' موت ہی سے انتقام نہیں، اُن قوّتوں سے بھی زبردست انتقام ہے جو ایک فرد ہی نہیں، ساری دنیا کو خاک کر سکتی ہیں۔

'نہرو نامہ' قصیدہ نہیں، مرثیہ نہیں، نوحہ نہیں، ہاں یہ اُن قدروں کا شہر آشوب ہے
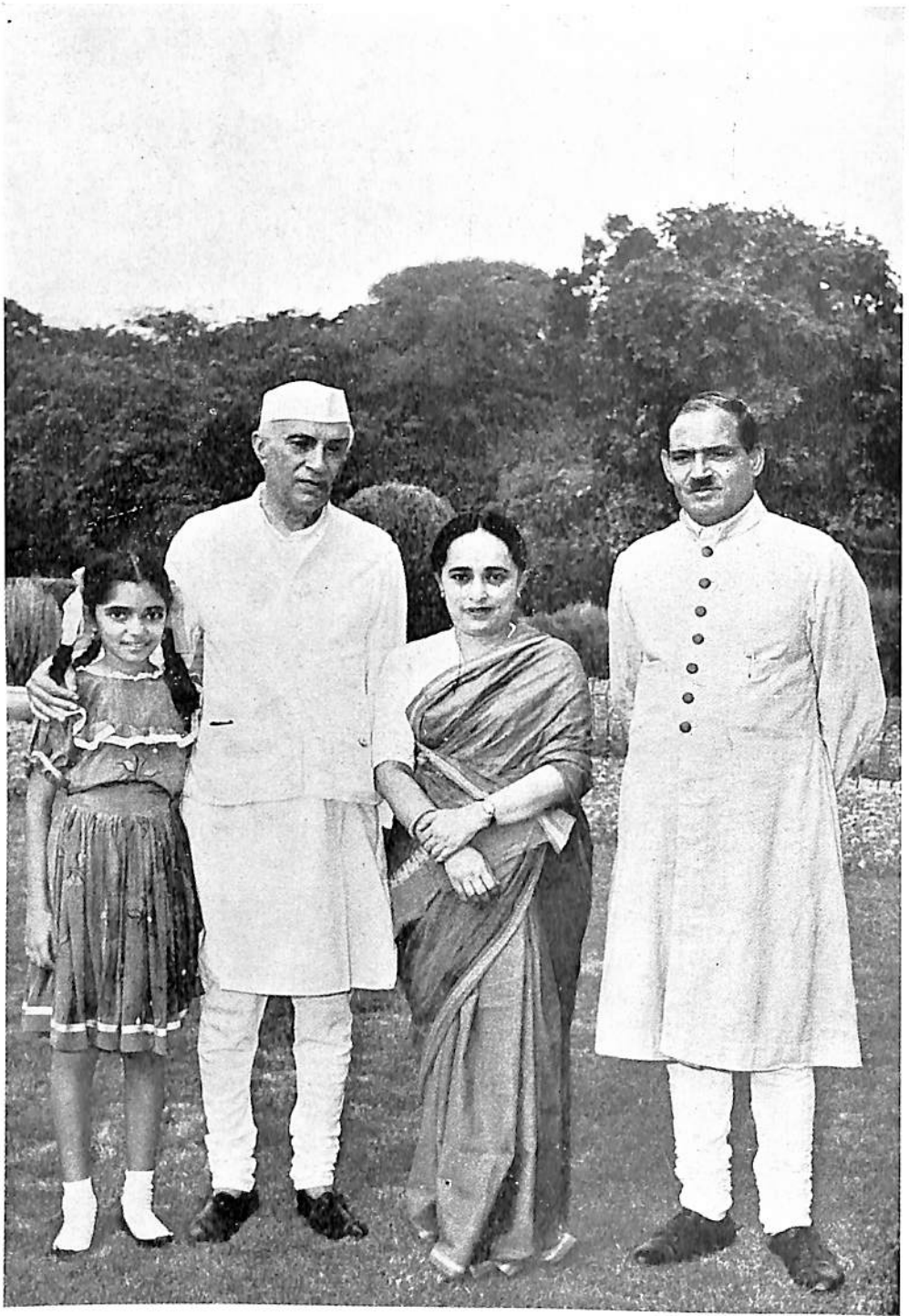
ساغر نظامی، محترمہ ذکیہ سُلطانہ نیّر، پنڈت جواہر لال نہرو اور رشنہ ناز ساغر

جن کے نہرو امین تھے۔ شہر آشوب صرف المیوں کا شیرازہ نہیں ہوتا بلکہ ایک نئی نشاط کی شیرازہ بندی کی آرزو بھی ہوتا ہے۔ نہرو مر گئے لیکن ساغر نے محسوس کیا ان کا زندہ رہنا زندگی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی سلامتی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا روز سورج کا نکلنا۔ "نہرو نامہ" جواہر لال کی نئی پیدائش ہے

یہ طویل نظم ساغر کے مرگ آسا الم، حیات آفریں اُمید اور آفاق شکار فکر کا ایک رُوپ ہے۔ اس کے محرّکات سمندروں کی طرح گہرے، کائینات کی طرح وسیع اور آسمانوں کی طرح بلند ہیں

اگر ہم ذرا اور فکر کی پہنائیوں میں اُتریں تو شاید کچھ اندازہ ہو کہ "دلِ ساغر میں کیا طوفاں بپا ہے"۔ ۵۰ سال سے جن خوابوں کے سہارے وہ جی رہے تھے اُن خوابوں کو وقت کا طوفان اس طرح بہا لے گیا جیسے جوار بھاٹا آتا ہے اور سمندر کی تند خُو موجیں ساحل کی ہر شئے کو سمیٹ کر لے جاتی ہیں اور انہیں سمندر میں گھول دیتی ہیں

اور یہی حال دُوسری طرف ہوا۔ موت جواہر لال کے خوبصورت اور عظیم خوابوں کو سمیٹ لے گئی

اگر دونوں کے خواب ایک نہ ہوتے، اگر ان دونوں کے ذہن میں قدروں کا اشتراک نہ ہوتا تو اس نظم کی حیثیت ایک رسمی مرثیئے جیسی ہوتی جس کے ہر لفظ میں ایک جھوٹا غم

ایکٹنگ کر رہا ہوتا

نہرُو اور ساؔغر کے درمیان سب سے عظیم اور اوّلین قدر سوشلزم تھی جسے اپنی فکر کا منتہا بنا کر ساؔغر نے اپنی بساط کے مطابق ساری عمر کام کیا۔ سچ پوچھیئے تو آزادی کے خواب کی تعبیر بھی یہی قدر ہو سکتی ہے

کوئی ۲۷ سال ہوئے ساؔغر نے اپنے رسالہ ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء میرٹھ میں آل پارٹیز مُسلم کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۰ء دہلی کے سوالنامے کے جواب میں ہندوستان کے دستُورِ اساسی اور طرزِ حکومت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس مضمُون میں ایک "سیکولر سوشلسٹ ری پبلک" کے بُنیادی اجزا اور عناصر پر روشنی پڑتی ہے خاتمہ پر ساؔغر نے لکھا تھا

"حکومت کی تشکیل بلاشبہ جمہُوری ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ جمہوریت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ تمام فرقہ وارانہ اور طبقاتی مسائل کی جڑ طبقاتی ناانصافی ہے جو اقتصادی ناانصافی پر مبنی ہے کوئی جمہوری حکومت جو عامتہ الناس (مزدُور و کسان) کو چند اصلاحی قوانین پاس کر کے مطمئن کرنا چاہتی ہے، وہ عوام کے مرض کا مستقل علاج نہیں کر سکتی محض مزدُوروں کی اُجرتیں اور بیکاروں کے لئے دستورِ اساسی کے بُنیادی

حقوق متعین کرنا اقتصادی ناانصافی کا علاج نہیں ہے اس لئے کہ بہت
سی جمہوریتیں اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں جو سرمایہ دارانہ اصولوں پر چلائی
جارہی ہیں۔ مجملاً یہ کہ حکومت عوام کے مفاد کی خاطر ہونی چاہیئے۔ اور اُس
میں کوئی چور دروازہ نہیں ہونا چاہیئے
اور سیکولرازم کی طرف اس طرح اشارہ کیا تھا

"بلاشک متصوّرہ قومی حکومت کا بہ حیثیت حکومت کوئی مذہب
نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر قسم کی فرقہ پرستی سے اس حکومت کو محفوظ ہونا چاہیئے
کوئی ایسا جزیہ عمل میں نہیں آنا چاہیئے جس میں قدیم روایتی جھلک پائی
جاتی ہو"

("متحدہ ہندوستان کا دستورِ اساسی"۔ ماہنامہ ایشیا میرٹھ دسمبر ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۱)

سوشلزم کے علاوہ دوسری قدرِ مشترک وہ دل سوزی اور رواداری تھی جو انسانیت
اور امنِ عالم کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ تیسری قدر وہ ارضیّت تھی جو اپنی دھرتی پر قدم
جمانا اور زندگی سے عشق کرنا سکھاتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ قدر نئے سماج کی پہلی اینٹ
ہے۔ جس کے قدم دھرتی پر نہیں جمیں گے وہ اس جنّت کی مسرتوں کو حاصل نہیں کر سکتا
وہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ اس کی آزادی اور غلامی ایک حیثیت رکھے گی۔ نہرو اور ساغر کے

مابین ایک اور قدرِ مشترک وہ روحانیت تھی جو جسم و جاں میں اُمید اور شرفِ انسانی کی شمع روشن کرتی ہے

اور وہ مادّیت تھی جو نہ ہوگی تو اس کے بغیر اب رُوحانیت کی خانقاہ میں اَبد تک اندھیرا رہیگا اور وہ سرفروشانہ لیکن مفکرانہ حُبّ الوطنی تھی جو ہر وہم اور وسوسے سے اُونچی ہو کر کسی دیس کو دُنیا کے تہذیبی اور اقتصادی معیاروں سے ہم آہنگ کرتی ہے

انسان دوستی کا وسیع اور ابدی تصوّر تھا، انسان کے مقدّر کی عظمت کا اقرار تھا اپنے عہد کی رفعت کا اعتراف تھا، اخوّت، امن اور ترقی کا احساس تھا، بیسویں صدی کی عالمی تہذیب کی اعلیٰ قدروں کا احترام تھا، علمی فکر و سائینس، تحقیق و جُستجو اور سوز و گداز سے بھری وہ عقلیّت تھی جس کی آج ساری انسانیت محتاج ہے اور جس کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی

آزادی کی حفاظت، آگے بڑھنے کا جذبہ، ستاروں کو چھُونے کی لگن، سماجی مساوات کی آرزو، دنیا سے ارتباط و محبت، حال پر گہری نظر، فردا پر ایمان بالغیب، ماضی کے حُسن کا اعتراف، حال کے حُسن سے کامران ہونے کا ولولہ اور مستقبل کے گیسوؤں میں شانہ کشی کا عشق!

اتنی باتیں مشترک نہ ہوتیں اور ساغر کی رُوح بھر نہ گئی ہوتی تو نہرو نامے کی تخلیق

بھلا ممکن تھی

نہرو نامے کی بساط پر تو ساغرؔ نے جان کی بازی لگا دی

وہ اُس کی تخلیق میں اُن کا گہرا استغراق، وہ شب و روز کی محنتِ شاقّہ

دفتر جانے سے پہلے فکر کرنا ، دفتر سے آ کر لکھنے کے لئے بیٹھ جانا، سارا گھر پڑا سو رہا

ہے اور وہ جاگ رہے ہیں، جیسے راتیں بھی دن ہوں۔ آنکھ کھُلتی ہے تو کیا دیکھتی

ہوں جس پہلو سے رات کو لکھنے بیٹھے تھے، اُسی پہلو سے بیٹھے لکھ رہے ہیں

نہ جانے کتنی راتوں کے سنّاٹوں نے اُن کے نالۂ نیم شبی سے استفادہ کیا اور نہ جانے

کتنی صُبحوں کے سرمئی دُھندلکوں نے اُن کی آہِ سحر گاہی کی موسیقی سے کرنوں کے

گیسوؤں کو سنوارا

دُھندلکے چھٹ جاتے، کرنیں اُن کی میز پر سر دھُنتیں اور پھر بھی وہ میز سے

نہ اُٹھتے، ناشتہ میز پر، چائے میز پر، کھانے کے نام پر فاقہ اور اگر کھا بھی لیا تو پھر

فکر کی پہنائیوں میں ڈوب جانا، ایک ایک صفحہ چار چار مرتبہ لکھنا اور پھر از سرِ نو نقل

کرنا اور پھر اس پر بھی نظرِ ثانی۔ نظرِ ثانی کے اسرار کوئی اُن سے پُوچھے۔ یہ نظرِ ثانی تو

اُس دن تک ہوئی جس دن کتابت کے لئے مسوّدہ کاتب صاحب کو دیا گیا۔ اور سچ

پُوچھیئے تو نظرِ ثانی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا

اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں پوری کارگاہِ فکر کا ہر وقت سفر، ہفتوں پوری پوری رات جاگنا، نہ دن کو آرام، نہ رات کو چین، نہ کوئی شغل، نہ کوئی تفریح بس خوابوں سے کھیلنا، جذبوں سے لڑنا، خیالوں میں بہنا اور احساس کی شدّت کے اُن تھپیڑوں کو سہنا جو نظم سے اُبل کر اُن کے وجدان و ادراک پر چھا جاتے تھے۔ آخر یہ عجیب و غریب ریاضت رنگ لائی اور اُن پر ہارٹ اٹیک ہو ہی گیا

ہارٹ اٹیک

۱۶ راگست ۱۹۶۵ء کی رات، پونے بارہ بجے عُرس حضرت محبوب الٰہی کے موقع پر عُرس محل نظام الدین اولیاء میں دل کا حملہ ہوا مگر اُن کی جان اُن کے جسم میں کہاں تھی، نہرو نامے میں تھی۔ موت اُن تک غلط پہنچی تھی

پورا ایک سال (۱۹۶۶ء) دل کی بیماری میں بیتا۔ لیکن وہ اس نازک ترین حالت میں بھی نہ ملتے۔ ذرا جان آئی تھی کہ پھر وہی دن رات شروع ہو گئے، وہ صبح و شام پھر زندگی سے مذاق کرنے لگے

اس مرتبہ تخلیقی عمل، ترمیم و تنسیخ، نقل نویسی اور "مرصّع کاری" کے ساتھ ساتھ نہرو نامے کے انگریزی ترجمے کا کام بھی شروع ہو گیا

وقت بے وقت دوائیں کھانا، کبھی نہ بھی کھانا، کسی دن نہایت انتظام سے

کھانا، یہ بتانے کے لئے کہ بڑے محتاط مریض ہیں۔ مگر اُسی سخت محنت اور انہماک کے
عالم میں، میں نے اُن کے چہرے پر ایک روشنی اور توانائی دیکھی، ایک بے پناہ خاموش
مسرّت دیکھی۔ ان کی ریاضت ہی ان کے لئے آبِ حیات بن گئی تھی

یہ ہے وہ لگن، ہمّت، رجائیّت، ارادے کی قوّت اور اس کی چٹان جیسی مضبوطی
جس نے ہر دَور میں انہیں فاتح کی حیثیت سے آگے بڑھایا ہے

اور اس بار بھی جب کہ زندگی کے مورچے پر موت سے بھی انہیں دو دو ہات
کرنے پڑے، مایوسی کی چٹانیں پگھل گئیں اور جتنے وہ آگے بڑھتے گئے اُن کی فکر نے اُن
کا دامن بے شمار اُمیّدوں سے بھر دیا، ان اُمیّدوں نے تخیّل کو ابدی حقیقت بنا دیا
اور یہ ابدی حقیقت اُٹھتی گئی، اُٹھتی گئی۔ بالآخر ایک لافانی شخصیّت کا پُورا مجسّمہ
ستاروں کو چھُونے لگا

یہ ہے نہرُو نامے کی تخلیق کی تاریخ!

اس مجاہدے پر جن بزرگوں اور دوستوں نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا، میں
اُن کا کیا شکریہ ادا کروں، میرا شکریہ ان کی محبت اور عقیدت کے سامنے کوئی حیثیت
نہیں رکھتا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ان کا حق تھا، فرض تھا۔ پھر بھی میں اس مخلصانہ سلوک
پر خاموش نہیں رہ سکتی۔ الفاظ ساتھ دیں یا نہ دیں، میں شکریہ ادا کرونگی

راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین زندگی کی بلند قدروں کا ایک نشان

ہمارے راشٹرپتی خود زندگی کے بلند اصولوں اور اعلیٰ قدروں کا نشان ہیں آپ نے نہرو نامہ کو شرفِ قبولیت بخشا، گہرے خلوص کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا۔ آپ کے ارشادات تاریخ کی تقدیس ہیں، صداقت اور خلوص کی توثیق ہیں کیوں نہ ہوں، راشٹرپتی نے ۵۰ سال ساغر کے ایمان و استقلال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے

یہ پہلی چند سطور ہی مُنہ سے بول اُٹھتی ہیں کہ آپ موضوع کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ساغر کی ذات اور کام سے کتنی محبّت ہے اور آپ ان کی کتنی عزت فرماتے ہیں۔ یہ احترام، محبّت اور عزت بہت ہی گرانقدر ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے راشٹرپتی کا شکریہ ادا کرتی ہوں

اور یہ بات بھی کم فخر کا باعث نہیں کہ دُوسرے بزرگانِ ادب۔ نے بھی نہرو نامہ کے ادبی مرتبے کو محسوس کیا اور اس کا بے ساختہ اعتراف کیا۔ میں

پروفیسر رشید احمد صدیقی ڈاکٹر تارا چند

ڈاکٹر سیّد محمود اور سیّد سجّاد ظہیر

کا بھی دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں

اور اُن کی بھی شکر گذار ہوں جن کے ہات اپنے بزرگوں کی طرح عصرِ حاضر کی نبض پر ہیں۔ ساغر سے جنہیں دُوسروں کی طرح رُوحانی تعلق ہے، مگر اس کے باوجود وہ تنقید کے سلسلے میں تعلقِ ذاتی کی پرواہ نہیں کرتے

ان سب نے ہر موڑ پر میرا ہات بٹایا اور نہرُو نامے کو اپنی خوبصورت اور حکیمانہ نثر سے ارژنگِ مانی بنادیا۔ یہ لوگ اُردو ادب کی اُمیّد ہیں۔ انور صدیقی، مخمورؔ جالندھری اور بلراج کومل کی ذات سے اُردو ادب کا مستقبل اور ترقّی وابستہ ہے

دو مرصّع کار اور بھی یاد آئے۔ سردار جسونت سنگھ اور راج کرشن کپوُر، جسونت سنگھ صاحب نے نہرُو نامے کا سرِورق بنایا اور اس کے پیکر کو اپنے نقوش سے سجایا، راج کرشن کپوُر نے خوشنویسی کے فرائض ادا کیئے۔ ان مخلص اور بلند فنکاروں کی بھی میں شکر گذار ہوں کہ آنسوؤں کو گوہرِ نایاب انہیں کے گوہر تراش ہاتھوں نے بنایا

اُردو کے بعد انگریزی اور ہندی ایڈیشن

اُردو ایڈیشن کی اشاعت بھی موجُودہ زمانے میں ایک بڑا کام تھا، لیکن اس نظم کی آفاقیت کا تقاضہ ہے کہ یہ ہندی اور انگریزی میں بھی چھپے۔ یہ ایک عظیم منصُوبہ ہے جس کی تکمیل کے لئے بڑے سرمائے کی ضرُورت ہوگی۔ ہر چند سرمایہ ہمارے

پاس نہیں ہے، مگر تمنّا اور عزم کی دولت ضرور موجود ہے تمنّا اور عزم نے تاریخ میں نئی نئی تہذیبوں اور تمدّنوں کے چراغ جلائے ہیں۔ ادب تو تہذیب کا ایک جزو ہے

اس لئے منصوبہ عظیم سہی، اندھیرا گہرا سہی، بے حسی بسیط سہی، مگر میں مایوس نہیں۔ آج سے کل کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ آج تک جتنا کام ہو چکا ہے وہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں

اُردو ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ ناگری لپی میں لفظوں کے معنی کے ساتھ ہندی مسوّدہ بھی ترتیب دیا جا چکا ہے اور انگریزی ترجمہ فائنل ہو چکا ہے۔ میں انگریزی ترجمہ شائع کرنے کے سلسلے میں دن رات کوشاں ہوں۔

انگریزی میں نہرو نامہ کو منتقل کرنے کا سہرا اُردو کے ترقی پسند نقّاد اور شاعر جناب مخمورؔ جالندھری کے سر ہے جس میں پروفیسر انور صدیقی اور بلراج کومل کے مفید مشورے بھی شامل ہیں

اس اعصاب شکن کام میں

جناب علی محمد طارق سابق وزیر سیر و سیاحت حکومت جموں و کشمیر

لالہ بینی پرشاد رئیسِ اعظم دہلی

چودھری برہم پرکاش ممبر پارلیمنٹ دہلی

حکیم عبدالحمید خان صاحب اور

مظفر حسین صاحب برنی

کی ہمدردیوں اور مدد نے مجھے بڑی ہمت بخشی، نہیں تو اس اندھے بہرے دور میں شعروادب کے لئے کام کرنا چٹانوں کو نچوڑنا ہے

میں اُمید کرتی ہوں کہ اِن کی اور اُن اصحاب کی ہمدردیاں بھی، جو ہمارے کام کی اہمیت کو محسوس کرینگے ہماری پُشت پناہی کرینگی اور ہم ساحل پر پہنچ کر دم لینگے

۲۸ جولائی ۱۹۶۷ء

نئی دہلی

ذکیہ سلطانہ نیّر

نہرو نامہ
ساغر نظامی

نہرو نامہ

رمزِ حیات

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار زندگی اسرار

ہے بقا و فنا کا اک چشمہ   ایک بے نام ازل کے منبع سے

ایک انجان ابد تلک جاری

کبھی نوحہ کناں کبھی خنداں   کبھی گریہ فشاں کبھی رقصاں

اک طلسماتِ رنج و عیش دوام   ہے تبسم کبھی، کبھی آنسو

کبھی طوفان ہے کبھی ساحل   کبھی جادہ ہے اور کبھی منزل

کبھی رنگیں قبا کبھی ہے کفن — جلوۂ گل کبھی خزانِ چمن

کبھی گہوارۂ مسرّت ہے — کبھی گل پوش لوحِ تربت ہے

اِک تسلسل حیات کا پیہم — اک تواتر ممات کا پیہم

غمِ انساں سے بے نیاز یہ جبر — دن پہ طاری ہے رات پر طاری

ذرّے ذرّے میں ہے سمایا ہوا — کائنات و حیات پر طاری

مہدِ مادر کبھی، کبھی ہے مزار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

جب سے کھولیں حیات نے آنکھیں — موت بیدار ہے اُسی دن سے

موت جس دن سے کار فرما ہے — زندگی اپنے قصرِ رنگیں میں

اُسی دن سے وجود آرا ہے

ایک گیسو کے پیچ و خم میں نہاں — لاکھ آرائشِ خمِ گیسو

اور تہذیبِ ہر خمِ گیسو — سو نئے پیچ و خم کا ساماں ہے

نو بہ نو پیکروں کا اک طوفاں — تازہ دم مظہروں کا ایک ہجوم

ہر سحر نیم وا کلی کی ہے سیج — اور ہر شام اک جنازۂ گل

ہر شب ماہ خواب گاہِ گلاب

بادِ صرصر کے گرم جھونکوں میں اک نئی فصلِ گُل خراماں ہے

نکہتِ گُل کی نرم چاپ نہیں ہے دھمک یہ خزاں کے قدموں کی

نہیں افسُردگی، تبسّم ہے آہ کے بھیس میں ترنّم ہے

صُبحدم پھُول کے بکھرتے ہی سینکڑوں غُنچے مسکراتے ہیں

اور غُنچوں کے مُسکراتے ہی گُل کے اوراق خاک پر گِر کر

رنگ و بُو کو کفن ہیں پہناتے

اور تجہیزِ گُل کے ہوتے ہی چھیڑ دیتی ہے نغمہ فصلِ بہار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرارِ زندگی اسرار

اک ستارہ جو ڈُوب جاتا ہے اس کے مرقد کے گھور اندھیرے سے

سو ستارے طلوع ہوتے ہیں

اور پھر صبح کے دُھندلکے میں وہ ستارے بھی ڈُوب جاتے ہیں

کل تھا مسکن جہاں اندھیروں کا روشنی مُسکرا رہی ہے وہاں

روشنی مسکرا رہی تھی جہاں اُس جگہ خیمہ زن ہے تاریکی

روشنی ہے کبھی اندھیرا ہے
کبھی شب ہے کبھی سویرا ہے

روز آغوشِ صبح میں خورشید
روز پہلوئے شب میں ماہِ تمام

شفقِ شام، مہر کا تابوت
چاندنی تربتِ عروسِ قمر

چاند ہے ہر کرن کا سنگِ مزار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

ہر گھڑی رقص میں ہے اک آواز
ہے مسلسل حیات کی پرواز

ہے مسلسل صدائے نغمۂ ساز
اور ہر نغمہ ایک نوحۂ ساز

اور ہر نوحہ نغمہ آغاز

نئے ساز و صدا نئے نغمے
ہیں نئے رنج اور نئے نوحے

ٹوٹتا تار ہائے بربط کا
اک نئے راگ کا ترنّم ہے

ہر ترنّم کے جزر و مد میں نہاں
اک قیامت کا شورِ ماتم ہے

جام میں ایک بال پڑتے ہی
چاک سے لاکھ جام اُبھرتے ہیں

اور ہر دورِ جام میں پنہاں
ایک طوفانِ گریہ و ماتم

اور جو دیکھا تو چند لمحوں میں　　بزمِ ماتم پہ خندہ زن ہے نشاط

پھر وہی دورِ جام و رقصِ نگار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

کسی تعمیر کا کھنڈر ہونا　　نئی تعمیر کا تبسّم ہے

نئی تعمیر کے تبسّم میں　　رُوحِ تخریب کا ترنّم ہے

شمعِ محفل کی تاک میں ہے سحر　　اور سحر ہے شکارِ تیرہ شبی

ہے مقدّر خروشِ دریا کا　　مستقل خامشی و تشنہ لبی

سطحِ دریا کا دردِ پایابی　　نئے طوفان کی علامت ہے

نئے طوفان کی خشُونت میں　　تازہ روئیدگی کی نُزہت ہے

تازہ روئیدگی کی نزُہت میں　　نفَسِ گرم کی تمازت ہے

نخلِ نرگس میں لاکھ سنگِ مزار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

سر جُھکائے یہ رات کی دیوی　　اور دُلائی یہ چاند تاروں کی

جیسے اوڑھے کوئی حسینہ ہو   سُرمئی شال کامدانی کی
نیلگوں آسماں میں یہ مہِ نو   جیسے دریا میں زرفشاں کشتی
شمع بردار ساتھ ساتھ انجُم   نیلمیں سطح پر رواں کشتی
یہ گماں بھی نہ تھا کہ ابرِ سیہ   ہے تعاقب میں ماہِ انور کے
اور ہے شب خُون مارنے والا
لیکن اک آن میں اندھیرے نے   نیلگُوں آسماں سیاہ کیا
قافلہ ماہ کا تباہ کیا

پُرسکوں صُبح کے دھندلکے میں   مُسکراتے یہ نیم وا غُنچے
کھِلکھلاتے یہ نیم وا غُنچے
صُبح کے بربطِ نگاریں پر   گنگناتے یہ نیم وا غنچے
چہچہاتے ہوئے دھندلکے میں
اک نئی زندگی کا رقصِ بہار
حکمتِ مرگ وزیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

۷

کاش یہ وقت جاوداں ہو جائے　　موت تھک کر یہیں کہیں سو جائے

اور ابد تک نہ ہو سکے بیدار

لو وہ خورشیدِ تابناک کی آگ　　اُفقِ صبح سے دہکتی ہوئی

پھُوٹی اک سیلِ آتشیں کی طرح

نہیں خورشید جل رہی ہے چتا　　خواب آلود ماہ پاروں کی

مُسکراتے ہوئے ستاروں کی

شمعوں کی غنچوں کی بہاروں کی　　رقص کرتے ہوئے نگاروں کی

شب کے مہکے ہوئے گلابوں کی　　بزمِ دوشینہ کے ربابوں کی

تال کی لَے کی راگ کی یہ چِتا　　دلہنوں کے سہاگ کی یہ چِتا

کائناتِ جمال کی یہ چِتا　　زندگی کے جلال کی یہ چِتا

نہیں یہ تختِ آفتاب نہیں　　ہے زمان و مکاں کے کاندھوں پر

روز و شب ماہ و سال کی یہ چِتا

زندگی اِس چِتا کا دُود و غُبار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

نَو بہ نَو اک نمُود اک تحلیل — نو بہ نو اک طلوع ایک غرُوب

نَو بہ نَو اک شگفتنِ پیہم — نو بہ نو اک فسُردگی کا غبار

نو بہ نو اک شکست ایک ظفر — ہر نفَس تیغ ہر نفَس ہے سپَر

نَو بہ نَو اک مسرّتِ فانی — ہر نفس اک نمُودِ رنجِ دوام

اک تماشائے ہست و نیست مُدام

ہو رہا ہے ازل سے دنیا میں — موت اور زندگی کا رقصِ دوام

زندگی کی عطا بھی لامحدُود

اور قہرِ فنا بھی لامحدُود

سنگِ مدفن میں زندگی کی ہُمک — مہدِ مادر میں سو رہے ہیں مزار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اَسرار، زندگی اسرار

حکمتِ مرگ و زیست برحق ہے

لیکن اسرارِ مرگ و زیست ندیم

بندگانِ نزار کیا جانیں

جبر اور اختیار کے مارے
جبر اور اختیار کیا جانیں

ترک ہی ترک جن کی قسمت ہے
عشرتِ اختیار کیا جانیں

بے قراری ہی جن کی ہے تقدیر
وہ نشاطِ قرار کیا جانیں

حکمتِ کردگار کے یہ شکار
حکمتِ کردگار کیا جانیں

جو مشیّت کے غیظ کے ہیں ہدف
وہ مشیّت کا پیار کیا جانیں

روزِ اوّل سے آج تک ہے ندیم

زندگی صرفِ داستانِ الم
صبح ماتم ہے شام ہے ماتم

اتنی بے اعتبار ہے یہ حیات بندۂ اعتبار کیا جانیں
نغمۂ آبشار و جلوۂ گُل ہے خزاں کی بہار کیا جانیں

جن کے کانوں میں گونجتی ہے مُدام
موت کی خوفناک مُوسیقی
وہ نشیدِ ہزار کیا جانیں

لُٹ گئے جو بہار سے پہلے وہ خزاں اور بہار کیا جانیں
نہ مہک موجۂ نسیم میں ہے نہ کشش نکہت و شمیم میں ہے
نہ ہے احساس بادِ صرصر کا نہ لہک رنگ و بُو کی پھُولوں میں

پھُول کانٹے ہیں اُن کی نظروں میں
اور کانٹے صلیبِ موسمِ گُل
اور ہر شاخِ گُل ہے اک تلوار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
مَوت اسرارِ زندگی اسرار

۱۱

مرگِ نہرُو پہ یوں ہوا محسوس　　جیسے دل پر کوئی چٹان گرے
رُوح پر جیسے آسمان گرے

شعلہ افگن ہوئے تصوّر میں　　اس طرح حال اور مُستقبل
ایک جلتا مکان ہو جیسے
نذرِ آتش جہان ہو جیسے

سبز و شاداب باغ سے جیسے　　موسمِ گُل میں باغباں اُٹھ جائے
چلتے چلتے رہِ حوادث میں　　جس طرح میرِ کارواں اُٹھ جائے

مرگِ نہرُو پہ یہ ہوا محسوس　　کہ زمیں دوز ہو گئی ہیں تمام
چوٹیاں برف زا ہمالہ کی

عظمتِ ہند کی شبیہہِ عظیم — آن کی آن ہو گئی تحلیل
بُجھ گئی شمع بزمِ مشرق کی — شرق سے غرب تک اندھیرا ہے
صرف دَیر و حرم نہیں تاریک — میکدوں میں بھی آج اندھیرا ہے
موت اُس کی نہیں ہے موت ہے یہ — آشتی کی عظیم قدروں کی
موت اُس کی نہیں ہے موت ہے یہ — زندگی کی عظیم قدروں کی
موت اُس کی نہیں ہے موت ہے یہ — امن کے اک حسیں پیمبر کی
نوعِ انساں کے اک شفیق کی موت

موت ہے پیکرِ اخوّت کی — اک تصوّر کی اک حقیقت کی
ایک تہذیب اک روایت کی

جس نے دنیا میں حادثہ یہ سُنا — اس طرح غم سے ہو گیا ساکت
اس طرح آنسوؤں میں ڈوب گیا — جیسے اس کے حبیب کی ہے یہ موت
اک عزیزِ قریب کی ہے یہ موت

اے سیہ رُو فرشتگانِ فنا — سنگدل اے مجاورانِ بقا
بے نیاز اے مشیّتِ ایزد — اے نظامِ بقا، طلسمِ فنا
آہ ایسے رفیقِ انساں کو — آخری دولتِ غریباں کو

تم نے ہم بے بسوں سے چھین لیا — تم نے ہم بے کسوں سے چھین لیا

دردِ دل کس سے اب کرینگے بیاں — دردمندوں کا رازداں نہ رہا

کِس سے ذکر بلاکشی ہوگا — سرپرستِ بلاکشاں نہ رہا

اب زباں کا خُدا ہی حافظ ہے — دہر میں اپنا ہم زباں نہ رہا

ہائے کس آستاں پہ سر دُھنیئے — آہ مسجودِ بے کساں نہ رہا

کِس سے اب داستانِ غم کہیئے — ہائے وہ جانِ داستاں نہ رہا

جس سے ہوتی تھی بارشِ اکرام — اِس زمیں پہ وہ آسماں نہ رہا

ہے جو قوموں کے پیار کا حاصل — اُس تمدّن کا پاسباں نہ رہا

رُخِ تہذیب کا جمال تھیں جو — اُن روایات کا نشاں نہ رہا

رُوحِ فنکار ہے اُداس اُداس
رُوحِ شاعر پہ ایک عالمِ یاس
جسمِ رقّاص ہوگیا پتھّر
سرد ہیں رُوح و دل مغنّی کے
ذہن جامد ہوا مفکّر کا
مُوقلم رو پڑا مصوّر کا

نقش کے رنگ بن گئے آنسو

چشمِ فنکار میں تلاطم ہے ۔۔۔ اس کے خوابوں کا رازداں نہ رہا

علم و فن سرنگوں کہ دُنیا میں ۔۔۔ علم و فن کا مزاج داں نہ رہا

ہے ادب غم زدہ کہ محفل میں ۔۔۔ وہ ادیبِ گہر فشاں نہ رہا

قدرِ ماضی کا پاسباں نہ رہا ۔۔۔ نئی قدروں کا رازداں نہ رہا

امنِ عالم کا نغمہ خواں نہ رہا ۔۔۔ ویَر اور بُدھ کا ترجماں نہ رہا

وہ جواہر وہ رتن دُنیا کا ۔۔۔ ہائے وہ گنجِ شائگاں نہ رہا

جس سے تھا کارواں کو عزمِ سفر ۔۔۔ آہ وہ میرِ کارواں نہ رہا

حال و ماضی میں رشتۂ رنگیں ۔۔۔ کل کے خوابوں کی جشن گاہِ حسیں

آرزوؤں کا شبستاں نہ رہا

دردِ انسانیت خُدا حافظ

آدمیّت کا قدرداں نہ رہا

زندگی اُس کی اضطرابِ حیات ۔۔۔ موت اس کی ابد کے دل کا قرار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

اے مری جنم بھوم اے ماتا

مہدِ مادر سے خاکِ قبر تلک

تیری گودی بہشتِ راحت ہے

سب کا گہوارۂ حیات ہے تو — اور آغوشِ خواب گاہِ دوام

معبدِ علم و فن سلام تجھے — السلام آستانِ عشق و وفا

حسن کی انجمن سلام تجھے

ہے تبسم ترا طلوعِ بقا — اور آنسو ترے فنا کا سکوت

خلق کرتی ہے پالتی ہے تو — پال کر اپنے دل کے ٹکڑوں کو

مثلِ انجم اُجالتی ہے تو

اور جب ہجر سہہ نہیں سکتی　　　تو رہا قیدِ زیست سے کر کے

اپنی آغوش میں سُلاتی ہے

لوریاں تا ابد سُناتی ہے

تُو ہے وہ چشمہ زارِ جُود و سخا　　　فیض جس کا ازل سے ہے جاری

تُو نے انساں کے ذہن کی جھولی　　　حکمتِ لازوال سے بھر دی

دولتِ بے مثال سے بھر دی

علم و عرفاں کے تشنہ کاموں کو　　　نغمۂ سرمدی کے پیاسوں کو

کرشن کی تُو نے بانسری بخشی

جُستجوئے نجات تھی جن کو　　　انہیں گوتم کی آگہی بخشی

سازِ توحید کے جو شیدا تھے　　　انہیں نانک کی نغمگی بخشی

بادۂ امن کے جو پیاسے تھے　　　انہیں گاندھی کی آشتی بخشی

اور جو چاہی ظہور کی معراج　　　اور جو تیرے کرم کو آیا جوش

تو اُلٹ کر ہر اک حجابِ قدیم

حال کو دولتِ جواہر دی

گود تُو نے حیات کی بھر دی

اک نیا لعلِ شب چراغ دیا　　　اہلِ دل صاحبِ دماغ دیا
پاک و اُطہر مے بصیرت کا　　　اک چھلکتا ہوا ایاغ دیا
وہ قدامت کے قصرِ ویراں میں　　　اک نظر سوچ اور تحیّر کی
اک لگن کھوج اور تفکّر کی

اشکِ امروز چشمِ عبرت میں　　　ٹیس اک سینۂ اخوّت میں
اور جوڑے میں رُوحِ جدّت کے　　　خُلدِ نوروز کی بہار کا پھُول
رُوحِ انسانیت کی وہ تقدیس　　　عصرِ نو کی جبیں پہ قشقۂ نور
ایک باغی کہ جس کی فطرت تھی　　　اپنے عکسِ وجُود سے بیزار
آئینہ خانۂ روایت میں

مردِ میدانِ جنگِ آزادی　　　خوں فشاں مورچوں پہ برق و شرر
امن کی بزم میں حسین کنول

زندگی اُس کی شمعِ منزل و راہ　　　مشعلِ کارواں چِتا کے شرار
خاک بھی اُس کی شمعِ راہگذار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

گود میں لکشمی کے کھولی آنکھ سائے میں وہ سرسوتی کے پلا
عیش و عشرت میں وہ جواں ہوا
اور جواں ہو کے جب نظر ڈالی اپنے ماحول کی کثافت پر
اپنے ماحول کی جہالت پر اپنے ماحول کی قدامت پر
صدیوں کی مستقل غلامی پر
قرنوں کے دردِ ناتمامی پر
بھوک اور پیاس کے جزیروں پر اپنے ٹوٹے ہوئے سفینوں پر
تو ہر اک اشک میں اُمڈ آیا
ایک طوفاں جنونِ خدمت کا

اُس کے احساس میں بھڑک اُٹھا ایک شعلہ نئی بغاوت کا
اور خود اس کے لطیف پیکر سے اک نئے شخص کا ظہور ہوا
تھا جو دار و رسن کا دیوانہ بیڑیوں سے جسے محبت تھی
سازِ راحت تھیں جس کو زنجیریں جیسے پھولوں کا ہار طوقِ گُلو
جیسے ہر موسمِ بہاراں میں تنگ زنداں چمن کا آنگن تھا
تھی اندھیروں سے چاندنی جس میں سوزِ دل سے تھی روشنی جس میں
کاٹ کر ہفت خواں مصائب کے کیا اُس نے جہانِ نو پیدا

اور غلامی کی کاٹ دی زنجیر
ایشیا کی بدل گئی تقدیر
سوال آزادیٔ وطن کا نہیں

اپنے خونِ جگر سے اُس نے دیا رُوحِ آزادیٔ وطن کو فروغ
موجۂ چشمِ تر سے اُس نے دیا آتشِ لالۂ چمن کو فروغ
اُس نے اپنی تباہ جنّت کو اِک نیا نقشۂ بہار دیا
مُسکرانے لگے نئے خاکے جگمگانے لگے نئے خاکے
دَیر و کعبہ میں کوہ و صحرا میں ایک جشنِ حیات ہونے لگا

ایک رقصِ حیات ہونے لگا

سُن گے ہر سمت نغمۂ تعمیر　　خود اُبھرنے لگے در و دیوار

ہر نظر اُس کی اک پیامِ حیات　　ہر نفس اُس کا نغمۂ معمار

بس رہی ہے مکاں میں بُوئے مکیں　　اب بھی ہیں وجد میں در و دیوار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار زندگی اسرار

حُسن

مُتلاشئ خیر تھا نہرو   شمعِ انصاف و حق کا پروانہ

حُسن کی جُستجو میں دیوانہ

حُسن وہ حُسن جس کے جلووں سے   محفلِ کائنات روشن ہے

دن ہے پُر نور، رات روشن ہے

افقِ شش جہات روشن ہے

مسکراہٹ ازل کے ہونٹوں کی   وہ ابد کے لبوں کا خندۂ شوخ

سازِ ہستی کی اک لطیف صدا   مُطربِ زندگی کا نغمۂ شوخ

ساز ہے نغمہ ہے نوا وہ حُسن   رنگ ہے نور ہے صبا وہ حُسن

مُسکراتا ہے جس کے پرتوَ سے　　پھُول میں موسمِ بہار وہ حسُن
کھِلکھلاتی ہے جس کی خوشبو سے　　خار میں رُوحِ لالہ زار وہ حسُن
زلفِ گیتی میں پیچ و خم جس سے　　روئے ہستی پہ جس کے دم سے نکھار
دلِ خالق کی آرزو وہ جمال　　رُوحِ مخلوق کی پکار وہ حسُن
یہ زمیں جس سے کشتِ انجُم ہے　　زندگی موجۂ تبسُّم ہے

اَبدی نُور کا تلاطُم ہے

شمع میں اُس کے نورِ رُخ کی ضیا　　جوت بن کر عیاں ستاروں سے

رنگ بن کر رواں ہے پھُولوں سے

شفقِ شام کی حسیں لالی　　چھوٹ اُس کے حنائی ہاتھوں کی
چاندنی اُس کے جسم کا اُبٹن　　دھُوپ ہے خاک اُس کے قدموں کی
اُس کے جوڑے کا پھُول ماہِ تمام　　سُورج اک ذرّہ اُس کی افشاں کا

جس کی خوشبو میں بس رہا ہے وجُود

جس کا ہر شے میں بج رہا ہے سرود

تھی اِسی حسُن کے لئے شب و روز　　اُس کی حِسِّ جمال وارفتہ

اُس کی چشمِ خیال محوِ تلاش

فکر کی دسترس سے ہے جو بلند — جو تصوّر کا منتہا ہے وہ حُسن
جو گرفتِ نظر سے ہے آزاد — جو تخیّل سے ماورا ہے وہ حُسن
جس سے سیّارگاں کو ذوقِ سفر — جو توازُن ہے زندگانی کا
وہ سراپا فسوں، وہ مہ پارہ — ایک ہنستا ہوا تسلسُل ہے
اک تواتُر ہے مستقل رقصاں
مُسکراتی ہوئی جوانی کا
زیست کے بیکراں اندھیروں میں — مشعلِ راہِ کارواں ہے وہ حُسن
نوعِ انساں کا منبعِ راحت — ہے رسد گاہِ امن و عیش وہ حُسن
غمِ ہستی کا جو مداوا ہے — جس کا سایہ دمِ مسیحا ہے
جس کے رنگین و شوخ ہونٹوں پر — گنگناتے ہیں شش جہات وہ حُسن
جس کی سرمستیٔ اشارت پر — رقص کرتی ہے کائنات وہ حُسن
تھی اسی حُسن کے تصوّر سے
اُس کی رُوحِ لطیف وجد کُناں
تھا اِسی حُسن کے تخیّل سے
اُس کا وجدان و عقل کیف نشاں

جس کی اُڑتی سی مسکراہٹ سے   غم میں بھی انبساط کا عالم
اک دوامی نشاط کا عالم
سینۂ کائنات کی دھڑکن
جسدِ زندگی کی رُوح و رواں

ذہنِ انساں میں جو اُبھرتا ہے   مہرِ کردار کی ضیا بن کر
دلِ انساں میں جو مچلتا ہے   دردِ تعمیر کی تڑپ بن کر
فکر میں چٹکیاں سی لیتا ہے   نئی ترتیب کی خلش بن کر
رُوحِ انساں میں سر پٹکتا ہے   آدمیّت کی آرزو بن کر
اور محبّت کی جستجو بن کر

وہ پجاری جمالِ قدرت کا   پیکرِ شوق و ذوق و صدق و صفا
وہ پرستارِ حسنِ خلقت کا

نامکمّل سماج میں پیہم   حسنِ کامل کا مستقل جویا
زندگی جس کی زندگی کی قسم   زندگی کو نکھارتے گذری
حسن کے لیے کراں تصوّر کی   زُلفِ پیچاں سنوارتے گذری
سنگ میں پھول میں ستاروں میں   کبھی جھلسی ہوئی بہاروں میں

کبھی اُجڑے ہوئے دیاروں میں کبھی حسرت کے ریگ زاروں میں

حُسن ہی کو پُکارتے گذری

وہ اسی آرزو میں خاک ہوا کہ فقط اِک کرن ہی مل جائے

حُسن کے ضوفشاں ستارے کی

اور زمیں رشکِ کہکشاں کر دے

اپنی دھرتی کو آسماں کر دے

خُلد ہی خُلد ہو دیار، دیار

اُس کی ہستی تھی سربسر تنویر موت انوار، زندگی انوار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

خیر

مُتلاشیٔ خیر تھا نہرُو!

خیر وہ خیر جس کا غازۂ رُخ رُوئے تخلیق کا جمال بنا
لمعہ خیر جس کا پرتوِ نور رُخِ تہذیب کا جلال بنا
جس کی گرمی سے رُوحِ انساں میں آگ روشن ہوئی تجسّس کی
جذبۂ خیر جس کی چنگاری بنی پہلی کرن تمدّن کی

رُوحِ فنکار میں ستارۂ فن!
دستِ محنت کشاں میں مشعلِ مُزد
ذہنِ دانشوراں میں شعلۂ فکر
دلِ پیغمبراں میں شمعِ نجات

کبھی شاعر کی رُوحِ تشنہ میں — موجِ الہام بن کے لہرائی

نغمۂ حُسن بن کے گونج اُٹھی — نالۂ عشق بن کے تھرّائی

جس کی تابش نے رُوحِ نغمہ کو — گرم الفاظ کا خزانہ دیا

اور لفظوں کو خلعتِ معنیٰ — اور معنیٰ کو بے کرانیٔ رمز

سنگ میں جودتِ بیاں رکھ دی

بے زباں کائنات کے مُنہ میں

حسرتِ خیر نے زباں رکھ دی

"خیر" کی نغمہ بار موسیقی — آنسوؤں کے رباب سے پھُوٹی

اور تلاشِ سکُوں میں یہ نِکلی

لبِ مُطرب پہ آ کے نغمہ بنی — اور نغمہ بنا فغاں کا علاج

ہر نوا داغِ زلیست کا مرہم — ہر صدا زخمِ خونچکاں کا علاج

غُنچے ہنسنے لگے تبسّم کے — پھُول کِھلنے لگے ترنّم کے

زندگی کیا ہے اک تسلسُلِ کیف — کائنات ایک معبدِ نغمہ

نغمہ ہے مستقل عبادتِ رُوح — نغمے کا زیر و بم رکُوع و سجُود

نغمے میں گم ہیں عبد اور معبُود

مُطرب خوش نوا نہیں مُطرب — رافت و امن کا پیمبر ہے
ہے خدائے نشاطِ ربّ سرُور — راحتِ زندگی کا داور ہے
زیست اُس کے رباب کی جھنکار
زندگی موت کا شکار نہیں — موت ہے اُس کی نغمگی کا شکار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہئے
موت اسرار، زندگی اسرار

"خیر" کی کیف بار فطرت نے — اک نئے بادۂ پرستش کا
جسمِ رقّاص کو سرُور دیا
نئی سرشاریوں کا پیمانا — ایک نیا جام، اک نئی صہبا
زہرِ آلام کا نیا تریاق
نشّہ آگیں اداؤں کی دُنیا
میکدے کھُل گئے رگ و پے میں — دَور چلنے لگے رگ و پے میں
رقص کے رُوپ میں بھڑک اُٹھّا — حسرتِ بندگی کا اک شعلہ
اور یہ مظلُوم نوعِ انساں کو — شمعِ امن و اماں دکھانے لگا
رَس کی گنگ و جمن بہانے لگا

تیغ و خنجر پگھل کے پھول بنے　　جس قدر زخم تھے گلاب ہوئے

داغ جتنے تھے ماہتاب ہوئے

چشمِ جلاد بن گئی آنسو　　دستِ قاتل سے گر پڑا خنجر

فن غمِ زندگی کا ہے فاتح!　　موت کیا ہے غمِ حیات کی ہار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہئیے

موت اسرار زندگی اسرار

جذبۂ خیر جس کی ضو تابی　　شعلۂ روحِ حسن کار بنی

اور نقاش کے تخیل میں　　بن کے ارژنگِ خال و خد ابھری

اس کی کرنوں کے نور سے بکھرے　　اَن گنت رنگ اور رنگوں کے

سینکڑوں شیڈ سینکڑوں سائے

اور اِن سایوں کے دھندلکوں میں　　آبشارِ جمال نغمہ کناں

اور اس خال و خد کی جنت میں　　زندگی نغمہ ریز و رقص کناں

جس کی تقدیر عہدِ شیب نہیں　　مسکراتی ہوئی وہ فصلِ شباب

گنگناتا ہوا وہ موسمِ گل

کہیں آنکھوں کے ساغرِ لبریز　　کہیں رخسار و لب کے سرخ گلاب

کہیں قامت کے سروِ محوِ خرام   کہیں سروں کی اوٹ ماہِ تمام

ایک طغیانیٔ نشاطِ دوام

غرقِ مستی بلندی و پستی   فن سے مغلوب ہے غمِ ہستی

جو مصوّر کا نقشِ جودت ہے   منبعِ عشرت و مسّرت ہے

خیر کی بے بہا امانت ہے   پوُری انسانیت کی دولت ہے

نقش کا فکرِ نقش کی تخلیق   رُوحِ نقّاش کی عبادت ہے

نقش کو دیکھ کر جو ہوتی ہے

وہ مسّرت بھی خیرِ اکبر ہے

زندگی ہے جنونِ خیر کا نام   موت محبُوبۂ حیات سے پیار

حکمتِ مرگ و زلیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

"خیر" کے جذبۂ تمنّا نے   رُوحِ معمار کو عطا کر دی

اک نئی صبح و شام کی دُنیا   در و دیوار و بام کی دُنیا

قصر و ایواں کے اَن گنت نقشے   معبدوں کے فلک نشاں خاکے

قلعہ و نہر و گلُستاں کا خیال   گلستاں میں روش روش کا جمال

نہر میں موجِ آب کے نغمے   اور ہر نغمہ قلقلِ مینا
عزمِ معمار کا جلال نہ پوچھ   عینِ طوفاں میں ہے وہ گرمِ سفر

رخشِ تخریب کو لگام دیئے
نقشہ ہائے دیار و شہر لیئے

زلزلوں کا یقین ہے پھر بھی   نئی بنیاد اُٹھائے جاتا ہے
نئی دیوار و بام و نقش و نگار   خونِ دل سے بنائے جاتا ہے
بادِ صرصر کے گرم جھونکوں میں   غنچۂ تر کھلائے جاتا ہے
آندھیاں اُس کے عزم کے آگے   ہیں نسیمِ بہار کے مانند
بجلیاں اُس کے سوز کے آگے   اک بجھے سے شرار کے مانند
اس کے ہاتھوں کے لمسِ ساحر سے   خشت میں پھول مسکراتے ہیں
جب بھی چھوتا ہے سنگِ مرمر کو   سینکڑوں تاج گنگناتے ہیں
سحر ہے سحرِ فطرتِ معمار   جنگلوں میں ہے زندگی اس سے
نہیں محلوں میں صرف اِس سے حیات   مقبروں میں ہے زندگی اس سے
ذہنِ بت گر میں خیر کے دم سے   اک صنم خانۂ حیات کھلا
وہ دریچہ وہ بابِ قصرِ حیات   نام جس کا ہے کائنات کھلا

رکھ دیا ہات جب چٹانوں پر — سینۂ سنگ کپکپانے لگا
توڑ کر پتھروں کی پرتوں کو — کارواں خال و خد کے مسکائے
یوں اجنتا کے نقش لہرائے — یوں ایلورا کے رنگ اُبھر آئے

موسمِ گُل میں رنگ رنگ کے پھول
ہر طرف جیسے مسکرا اُٹھیں
سنگ میں گنگنائے فصلِ بہار

زیست تعمیر کا سرورِ مدام — ابدی ہے یہ پتھروں پہ بہار

موت کیا ہے بتوں کے رُخ کا نکھار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

"خیر" نے بُت گری کے پردے میں — جب تراشے خُدا تراشے ہیں
زندگی بھر تلاشِ منزل میں — سنگ میں رہنما تراشے ہیں
تھیں جو حائل انہیں چٹانوں سے — بحر میں ناخدا تراشے ہیں
عُمر بھر اک اُمیدِ ساحل میں — اَن گنت ناخدا تراشے ہیں
جذبۂ بندگی کی مستی میں — کعبے اور بتکدے تراشے ہیں

ازلی تشنگی مٹانے کو ابدی میکدے تراشے ہیں
سینۂ سنگ سے نکالی ہے آگ اور آتش کدے تراشے ہیں
خاک سے فصلِ گُل اُبھاری ہے پھول کیسے صبا تراشی ہے
نغمے کو ہیئتِ ابد دی ہے ساز ڈھالے نوا تراشی ہے
ذرّے سے جامِ جم تراشا ہے عالمِ کیف و کم تراشا ہے
ہست ڈھالا، عدم تراشا ہے

ایک سورج ہزارہا کرنیں ایک جلوہ ہزارہا پرتو
ایک چشمہ ہزارہا موجیں ایک دریا ہزارہا قطرے
ایک جوہر ہزارہا مظہر

جامِ سقراط سے کبھی چھلکا کبھی اوجِ صلیب سے ٹپکا
خونِ انساں کی آبرو بن کر
اک نئی چشمِ جستجو بن کر
اور کبھی ذہن میں فلاطوں کے شعلۂ فکرِ انقلاب بنا
اک تصوّر نئی حقیقت کا ایک نئی زندگی کا خواب بنا
اک نئی آگہی کا خواب بنا

کرشن کی بانسری میں لہرایا — نغمۂ زندگی کی لے بن کر
ساغرِ ویر سے کبھی چھلکا! — اک نئے میکدے کی مے بن کر
کبھی گوتم کے جام سے چھلکا! — بادۂ امن و آشتی بن کر
کبھی فاراں کی چوٹیوں سے بہا — چشمۂ نطقِ سرمدی بن کر
اور کبھی ارضِ کربلا پہ بہا — آلِ احمدؐ کا یہ لہو بن کر
اور کبھی خاکِ کربلا سے اُٹھا — فصلِ ایثار کی گھٹا بن کر

خونِ ناحق کا خوں بہا بن کر

کبھی لینن کی آنکھ سے ٹپکا — نوعِ انساں کا آسرا بن کر
کبھی باپو کے نطق میں اُبھرا — امنِ عالم کا مُدّعا بن کر
خاکِ دہلی کے ذرّے ذرّے میں — خیر کے عشق نے بہا ڈالی

گرم و تازہ لہو کی اک جمن!

اِس کی سرد و لطیف شبنم نے — آگ کو گلستاں بنا ڈالا
ذرّے کو آسماں کی رفعت دی — خاک کو کہکشاں بنا ڈالا

آہ خیرِ مجسّم اے نہرو
آہ روحِ مکرّم اے نہرو!

تھی اسی خیر کی تلاش تجھے تھی اسی خیر کی لگن تجھ کو
ہاں یہی خیر رہ گذر تھا ترا ہاں یہی خیر تیری منزل تھا
زندگی تیری جستجوئے تمام موت بھی ہے تری تلاشِ مُدام
خیر کا بھید کس طرح پائے
اِسی دُھن میں نِکل گیا ہے کہیں خاک کا تیری کہہ رہا ہے غبُار
حکمتِ مرگ وزیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

حق

مُتلاشئ خیر بھتا نہرو!
شمعِ انصاف و حق کا پروانہ

حق ہے انسان کا پُرانا خواب
ایک خواب اور ہزار تعبیریں

عُقدہ اک اور ہزار تدبیریں
حلقہ اک اور ہزار زنجیریں

سُورج اک اور ہزار تنویریں
صُورت اک اور ہزار تصویریں

جاں، ہتیلی پہ رکھ کے صدیوں سے
آدمی کر رہا ہے حق کی تلاش

گھاٹیوں اور کوہساروں میں
جنگلوں اور ریگ زاروں میں

آگ اور خُون کے سمندر میں
بحر کے دل میں عرصۂ بر میں

سارا ماضی لہُو سے ہے رنگیں
پُوری تاریخ محضرِ خُونیں

لیکن اس قتل گاہِ انساں میں حُسن اور خیر و حق کے دیوانے
ہر تعدّی پہ مُسکراتے رہے

لاکھ طوفانِ برق و باد آئے شمع اپنی جلائے چلتے رہے
تیر سینوں پہ پڑ رہے تھے مگر حق کا پرچم اُٹھائے چلتے رہے
اپنی اپنی صلیب کاندھوں پر خندہ بر لب اُٹھائے چلتے رہے
گو شکنجوں میں کس رہے تھے مگر نغمۂ حق سُنائے جاتے تھے
رسن و دار شاخِ گُل تھی اُنہیں موسمِ گُل پہ چھائے جاتے تھے
گولیاں پڑ رہی تھیں سینوں پر اور وہ مُسکرائے جاتے تھے
حملہ آور تھا اک جہاں لیکن حق سے وہ لو لگائے بیٹھے تھے
تیاگ کر زندگی کی ہر راحت بَن میں دُھونی رمائے بیٹھے تھے

حق ہے انساں کا اک پُرانا خواب ایک خواب اور ہزار تعبیریں
لیکن اس خواب کی ہر اک تعبیر اک نئی صبح کا جمال بنی
اک نئے صِدق کا جلال بنی
تابشِ حق سے ہو گیا ٹکڑے صدیوں کا سخت حلقۂ زنجیر

نوعِ انساں کی کھُل گئی تقدیر

رُوحِ تقویم مُسکرانے لگی　　نئی تاریخ جگمگانے لگی

تھا اِسی حق کا تو بھی دیوانہ　　تُو بھی اس شمع کا تھا پروانہ

حُسن اور خیر اور حق کے لئے　　ہر خوشی اپنی تیاگ دی تُو نے

زندگی اپنی تیاگ دی تُو نے

اے پرستارِ حق سلام تجھے

اے نگہدارِ حق سلام تجھے

رمزِ ایثار زندگی تیری　　موت تیری حقیقتِ ایثار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

اُن اکَارِم کی آن تھا نہرُو — ان اکَابِر کی شان تھا نہرُو

ہیں جو عصرِ جدید کے معمار — ہیں جو حاضر سماج کے خلّاق

جن کی خلّاقیوں کے جادُو نے — خاک میں سو جہان ڈھالے ہیں

ذرّوں میں آسمان ڈھالے ہیں

جن کے ہر خاکۂ تخیّل میں — کھیت حقائق کے لہلہاتے ہیں

جن کے ہر نقشۂ حقائق میں — باغ خوابوں کے مُسکراتے ہیں

جن کے ہر صفحۂ تفکّر پر — نئی تاریخ مُسکراتی ہے

جن کے ہر نغمۂ تکلّم میں — نئی تقویم گنگناتی ہے

توڑ کر قیدِ رنگ و نسل و وطن — جن اکَابِر کی زیست بنتی ہے

نوعِ انساں کا بے بہا ورثا — ساری انسانیت کا سرمایا

جب تلاطُم میں جبرِ ظلمت کے — شعلہ احساس کا بھڑکتا ہے

ہر رگ و پے میں آنکھ کھُلتی ہے ذرّے ذرّے میں دل دھڑکتے ہیں

جب خودی جاگتی ہے انساں کی آگہی جاگتی ہے انساں کی

غیرتِ آدمی بپھرتی ہے جوش میں زندگی بپھرتی ہے

رُوحِ اخلاق جب اُبھرتی ہے جب عروسِ صفا سنورتی ہے

جب اُبھرتا ہے بندگی کا جلال بے کسی اور بے بسی کا جلال

توڑ دیتی ہے جوشِ غیرت میں جب بغاوت تونگری کی حدیں

جب صداقت ستم گری کی حدیں

اُس گھڑی دُھند میں اُبھرتی ہے رُوح اک جس کو رہنما کہیئے

عینِ طوفاں میں جست کرتی ہے موج اک جس کو ناخُدا کہیئے

اور یہ موج عینِ طوفاں میں شکلِ نہرُو میں مسکرائی تھی

ہند کے ڈُوبتے سفینے کو ساحلِ زندگی پہ لائی تھی

زندگی اُس کی آئینہ خانہ جس میں عکسوں کی ایک دُنیا تھی

کہیں ماضی کے ظُلم و جبر کا عکس کہیں انساں کے ضبط و صبر کا عکس

کہیں اُجڑے ہوئے سماج کا عکس کہیں قزّاق سامراج کا عکس

جابرانہ روایتوں کے نشاں ساحِرانہ حکایتوں کے نشاں

صدیوں کی جد وجہد کے پرتو
قرنوں کی ناتمامیوں کے نشاں

کہیں جابر شہنشہی کے خلاف
باغیانہ جلال کے پرتو

ہند و افریشیا کا عکسِ جمال
حُرّیت اور نجات کے خد وخال

وہ پیامی بقائے باہم کا
جس نے طوفاں کے رُخ کو موڑ دیا

اور عفریتِ جنگ کا جس نے
پنجۂ آہنی مروڑ دیا

اُگتے ہیں جس زمین میں ایٹم
اُس زمیں کے کرخت سینے میں

بو دیا بیج امنِ عالم کا

صرف وہ ہند کی متاع نہ تھا
ساری دنیا کی ملکیت تھا وہ

رُوحِ تاریخ جس پہ نازاں ہے
وہ فسوں اور وہ فسانہ تھا

جس سے ہر ساز مست و بیخود ہے
وہ مہکتا ہوا ترانہ تھا

سر سے پا تک فلاح تھا نہرُو

اک دعائے صباح تھا نہرُو

زندگی اُس کی احترامِ بقا
موت اُس کی، فنا کا عز و وقار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیے

موت اسرار، زندگی اسرار

ضو فشاں وہ حریمِ خواب کی شمع　　متبسّم چراغِ بیداری

دردِ انساں کا آبشارِ رواں　　عشقِ انساں کا چشمۂ جاری

پیار ہی پیار اور وفا ہی وفا　　رُوپ میں آدمی کے دلداری

شبِ تاریک غم میں مشعلِ راہ　　شورِ طوفاں میں روشنی کا ستوں

آندھیوں میں چراغِ منزل کا　　زلزلوں میں سکوں کی وہ قندیل

ضبط و برداشت صبر، حلم و رضا　　جذبۂ رحم و عدل، ذوقِ وفا

فیضِ قدرت نے لطفِ خاص کے ساتھ　　اُس کے کردار میں سمویا تھا

اُس کے فکر و عمل کے پرتو سے　　جھانکتے تھے اشوک کے تیور

ہو نہ ہو قتل گاہِ عالم میں — آئی تھی رُوپ میں جوآہر کے

مُضطر و بے قرار رُوحِ اشوک

اک نئی حسرتِ قرار لیئے

نئے فردوس کا تصوّرِ شوخ — نئی گُل بیز آرزُوئے حیات

اک اچھُوتے جہاں کا خواب لیئے

اک نیا ذوقِ انقلاب لیئے

کیا لکھوں میں اشوک کی بپتا — وحشت و جنگ کا شکار اشوک

خُونِ انساں میں ڈوب کر اُبھرا

لاکھ ہنستے ہوئے چراغ بُجھے — لاکھ مہکے ہوئے گُلاب جلے

تب کہیں اُس کی رُوحِ پُرغم میں — مُسکرایا ستارۂ ارتقا

اور پھر اک جہانِ نُور و ضیا — اُس کی رگ رگ میں جگمگا اُٹھّا

نیا انساں اشوک میں جاگا — اک نیا قرن ہو گیا بیدار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

لیکن اسرار کے تلاطُم میں — منفرد تھا قرینۂ نہرو

آگ اور خون کے سمندر سے　　دور نکلا سفینۂ نہرو
اُسے فیضانِ ارتقا نے دیا　　صبحِ نوروز کی صبا نے دیا
امن کا اک حسین و شوخ کنول　　فکرِ تازہ کا عطر بیز گلاب
علم و ادراک کا خزانۂ نو　　اُسے جبریلِ وقت نے بخشا
سوزِ باپو سے جو ملا تھا چراغ　　اُسے خورشید کر دیا اُس نے
اور وہ اِس عظیم ورثے کو　　عمر بھر رُوح میں چھپائے رہا

شمعِ ہر رہگذر بنائے رہا

لاکھ طوفان آئے وہ لیکن　　یہ حقیقت کبھی نہیں بھولا
کہ نتیجہ عروجِ کامل کا　　ہے فقط بے مہار بے عدلی

جبر اور ظلم کی فراوانی

خونِ انصاف سے اُبھرتا ہے　　کامیابی کا چشمۂ شیریں

اور پھر اک زوال کا صحرا

اور ہے انجام کامیابی کا　　ایک ظلمِ شدید کا جذبا
اور ظلمِ شدید کا انجام　　ایک اندھے غرور کا نشّا
اور نتیجہ غرورِ بے حد کا　　آدمیت اور آدمی کی فنا

لاکھ طوفان آئے وہ لیکن
یہ حقیقت کبھی نہیں بھولا

دین و تہذیب، حکومت اور اقوام   وقت کے کارواں کی گرد و غبار
فصلِ گُل ہے کسی کی فصلِ خزاں   اور خزاں ہے کسی کی فصلِ بہار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

اے مری جنم بھُوم ! اے ماتا

اے مری راحتِ ابد کی امیں

اے عرُوج و زوال کی دُنیا — بے کراں عظمتوں کا گہوارا

تیری مٹّی سے اُٹھنے والوں نے — کیف و وجدانِ سرمدی بخشا

فکر کو اک لطافتِ ابدی — ذہن کو فکر کا جلال دیا

رُوح کو کیفِ لازوال دیا

موت کو زندگی میں ڈھال دیا

نہیں آسان، اُس کی نقّاشی — نقشِ گُل ہائے رنگ رنگ تھا وہ

کتنی اعلیٰ روایتوں کا جمال کتنے افضل تمدّنوں کا جلال
کتنے اطوارِ زندگی کا نچوڑ کتنی قدروں کا بے بہا جوہر
دیدنی رنگ کتنے پھولوں کا کتنے غنچوں کی ان چھُوئی خوشبو
قوس بھی یہ بتا نہیں سکتی کہ تبسّم میں اُس کے خنداں تھی

کتنی شاموں کی دلرُبا لالی

مُسکراتی تھی اُس کی آنکھوں میں کتنے انمول موتیوں کی دمک

کتنے ہیروں کی نوُر پاش چمک

کتنی صدیوں کی چاندنی راتیں کتنے قرنوں کی چمپئی دھوپیں
اُس کے پُرجوش و نرم لفظوں میں کتنے کنولوں کی نرمی و خُنکی

کتنے تیغوں کی کاٹ کی جھنکار

کتنی رنگین حکمتوں کا نچوڑ کتنے بیدار فلسفوں کا زُلال

کتنی دھاراؤں کا حسین مِلن

کتنی ندیوں کا دلرُبا سنگم

جگمگاتا ہوا نشان تھا وہ نئی تہذیب کے تجمّل کا
جسے تاریخ نے سجایا ہے ارتقا نے جسے سنوارا ہے

توڑ کر خنجر و سنان و علم — اِسی دھرتی کی خاک میں مل کر
ذرّے ذرّے میں اِس کے حل ہو کر — مِلّتوں نے جسے بنایا ہے
یہ کنول اور گلاب کی تہذیب — بن گئی شیخ و شاب کی تہذیب
دیر کی مسجد و کلیسا کی — قریوں کی اور دیار کی تہذیب

نئے جشنِ بہار کی تہذیب

گنگنائی تمام دیس میں یہ — نیا نغمہ قدیم ساز لیئے

ساز میں سو نوائے راز لیئے

ویر کے سازِ دل کا سوز لیئے — کرشن کی شوخ بانسری کا فسوں
رام اور لکشمن کا تیاگ لیئے — اور بھرت کی بلندیٔ کردار
رُوحِ سیتا کا نُور دل میں لیئے — آندھیوں میں لیئے وفا کا چراغ
بُدھ کے احساس کے کنول کی مہک — اور محمدؐ کے پھُول کی خوشبُو
آریائی روایتوں کا جمال — عرب اطوارِ زندگی کا جلال
ساتھ لائی شکنتلا کے کنول — حُسن کاریٔ فکرِ کالیداس
رزم گاہِ حیات میں آئی — آنسوؤں میں دلِ اشوک لیئے
نُورِ کیلاش، برقِ طُور لیئے — حکمتِ نو کی شمع نُور لیئے

دلِ خسروؔ کا سوز و ساز لیئے
رُوحِ محبوب کا گداز لیئے

نسلِ افغان کا تصوّرِ عدل
ذہنِ سُوریؔ کا لمعۂ پرواز

آلِ تیمورؔ کا عرُوج لئے
بابرؔ و شاہجہاںؔ کا ذوقِ جمال

رُوحِ اکبرؔ کا اضطراب لیئے
اک نئے عشق کی شراب لیئے

اک نیا دینِ انقلاب لیئے

لیئے داراؔ کے قلب کی دھڑکن
اِک نئی جُستجوئے حق کی لگن

اِک نئی نسل کا حسین خیال
اک نئی قوم کا تصوّرِ شوخ

غیرِ فانی جمالِ اجنتا کا
تاجؔ کا حُسنِ لازوال لیئے

سازِ ہندی پہ نغمۂ ایراں
نِرت کے رُوپ میں لُٹاتی ہوئی

دوہے رسؔ خان کے سناتی ہوئی

رُوحِ عیسےٰ کا سوز و درد لیئے
دوش پر خونچکاں صلیب اُٹھائے

نغمے انجیلؔ کے سُناتی ہوئی

شعر شیلےؔ کے گُنگُناتی ہوئی

مغربی حِکمتیں لُٹاتی ہوئی

اسی تہذیب کے عناصرِ شوخ
بن گئے تاجدارِ آزادی

حسرت و آرزو کے صحرا میں — لائے یہ جوئبارِ آزادی
اِسی تہذیب نے جواہر کو — علم و ادراکِ زندگی بخشا
مشترک زندگی کا سرمایا — مُتحّد زندگی کا اِک ورثا

اِسی تہذیب نے اُسے سونپا

اِسی تہذیب کی فراخی نے — اُس کے احساسِ فیض کو بخشا

سینہ صحرا کا، دل سمندر کا

اِسی تہذیب کے تدبّر نے — دی جواہر کو عفو کی دولت

صبر اور درگذر کا اِک جذبا

اِسی تہذیب نے کیا آخر — نیا پیمانِ لندن و دہلی
ورنہ ہر ذہنِ مُنتقِم میں ابھی — خونِ تازہ تھا بے گُناہوں کا
اُس کی تعلیمِ آدمیّت نے — سب کو ظرفِ فرامُشی بخشا

سب کو انسانیت کا درس دیا

تھی یہی وحدتِ تضادِ صفت — جس نے نہرُو کے فکر کو بخشا

سیکولر نظم کا حسین خیال

اور نہرُو کی حق پسندی نے — سیکُولر نظم کے تصوّر کو

جامہ پہنا دیا حقیقت کا
اس حقیقت پہ آنچ آنے نہ پائے
شمع یہ زندگی کی بجھنے نہ پائے

کہ اسی شمع کے فروغ پہ ہے　　　اپنے جشنِ بقا کا دار و مدار
موت ہے رنگ رنگ پھولوں کی　　　کسی گلدستے کا بکھر جانا
یہ چمن ہے طلسمِ نیرنگی　　　نہیں یک رنگی پہ دوامِ بہار

جتنا اِس نقش کو مٹاؤ گے
اور اُبھریں گے اِس کے نقش و نگار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

وہ مورّخ ادیب، دانش وَر — اہلِ دل اہلِ ذوق اہلِ نظر
تازہ نقشِ حیات کا نقّاش — وہ نئے ذہن و فکر کا معمار
کششِ حُسن اُس کی شہر بہ شہر — اُس کی محبُوبیّت دیار دیار
اُس کی آوازِ نرم بانگِ درا — ہر نفس اس کا رہنما نغما
وہ تبسّم کہ جس کی موجِ لطیف — رُوح و دل کے غبار دھوتی تھی
دُور کرتی تھی ہر کثافت کو — حسد و دُشمنی و نفرت کو
بُغض کو، ظلم کو، کدُورت کو
چاندنی کی طرح حسین و لطیف — تازہ موجِ شمیم کے مانند
رافتِ کُل وہ رحمتِ یکسر — فیض اُس کا نسیم کے مانند

حال کیا اس کی تازگی کا لکھوں — صبحدم جیسے یاسمن کی کلی
کیا رقم نرمیٔ کلام کروں — جیسے برگِ گلاب کی نرمی
اُس کی تیز و حسین و شوخ نظر — اک کرن آفتاب کی سی تھی
دل نہ تھا اُس کے گرم سینے میں — ایک پتّی گلاب کی سی تھی
اُس کی دلسوزیوں کا یہ عالم — کہ دِوانے بھی ہوش میں آئیں
اُس کی دلداریوں کا یہ جادُو — کہ قرار عاشقوں کو آجائے

سر سے پا تک وہ ایک حُسن تمام
مُستقل ایک شانِ محبُوبی!

دوسروں کے غموں کا یوں احساس — جیسے یہ غم اُسی پہ بیتے ہیں
تھا وہ آدرش اُن اکابر کا — دُوسروں کے لئے جو جیتے ہیں
ذہن شاداب جیسے تازہ کنول — دل معطّر گلاب کے مانند
طیش اس کا سراب کی صورت — غیظ اس کا حباب کے مانند
اُس کی چُپ آبشارِ لُطف و کرم — کرم اُس کا تھا چشمۂ جاری
وضعدار و شریف اور حسّاس — ٹوٹنے سے جو بچ رہی تھی وہ آس!

اُس کی سب سے بڑی صفت یہ تھی

کہ فرشتہ نہیں وہ انساں تھا

اور یہ انساں ہر ایک کا محبوب، ساری دُنیا کی آنکھ کا تارا

اِس حسین و عجیب انساں کی قوم کے ذہن پر حکومت تھی

قوم کی فکر پر سیادت تھی

اِس عظیم و قدیر انساں کو قوم کی روح و دل پہ قدرت تھی

تھے عوام اُس کی اک جھلک پہ نثار اور دیوانۂ عوام تھا وہ

سچ یہ ہے اس کی چاندنی تھے عوام اور اُن کا مہِ تمام تھا وہ

معبدِ جذبۂ پرستاری کعبۂ عشق و احترام تھا وہ

ابر آلود صبح کا سورج اور اندھیرے میں نجمِ شام تھا وہ

وہ فقط کوئی ایک ذات نہ تھا رابطِ اقوام کی علامت تھا

ایک علامت شعورِ تازہ کی

زندگی کے نئے تصوّر کی

آدمی کے نئے تصوّر کی

اک علامت طلوعِ ساحل کی اک علامت فروغِ حاصل کی

شرحِ ماضی تھا، حال کی تفسیر کل کے خوابوں کی دلرُبا تعبیر

خفتہ اقدار کا عظیم نشان — خوب سے خوب تر کا اک رجحان
شمع کو تابنا کیٔ خورشید — ہر اندھیرے کو نور کا پیغام
شبِ دوشیں کی حسِ کلفت کو — ہلکے ہلکے سرور کا پیغام
شبِ طوفان کے تلاطم میں — خس کو عزمِ عبور کا پیغام
اک تبسم نئے تمدن کا — اِک تجمل نئے تزیّن کا

مسکراتے شباب کا پرچم
اک نئے انقلاب کا پرچم

کِس طرح اُس کا میں احاطہ کروں — فکر بے دسترس، قلم مجبور

اور وہ اک ساعتِ رواں کی طرح
میری تخئیل نارسا آغوش
اور وہ اک بحرِ بےکراں کی طرح

اپنے خوابوں کا اک جہانِ وسیع — آرزوؤں کا بےکنار دیار
زندگی کی صفت میں لامحدود — موت کے روپ میں ابد بکنار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

آہ وہ ساعتِ عجیب نہ پوچھ!

جب وہ اپنے جلالِ خاص کے ساتھ   دُوبدو موت کے تصوّر سے

آخری لفظ کہہ رہا ہوگا

جب فسُوں بے ہشی کا آنکھوں میں   جال سا ایک بُن رہا ہوگا

نگہِ واپسیں میں رہ رہ کر   اک ستارہ سا ڈوبتا ہوگا

موت اُس کو سُلا رہی ہوگی   زیست اُس کو جگا رہی ہوگی

اور وہ عظمت و جلال کے ساتھ

موت پر مُسکرا رہا ہوگا

اور آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
موت سے بڑھ کے کہہ رہا ہوگا

چل مری موت چل مجھے لے چل
میں ہوں تیّار، زندگی تیّار

باغ اگر بے شجر ہے ہونے دے
کھیت اگر بے ثمر ہے ہونے دے

چرخ اگر بے قمر ہے ہونے دے
رات اگر بے سحر ہے ہونے دے

کیا مرے دم سے ہیں یہ شام و سحر
نورِ خورشید اور یہ نورِ قمر

پھول اور یہ ثمر یہ برگ و شجر
میری دھرتی میں سانس لیتے ہیں

سینکڑوں پھول سینکڑوں تارے
سینکڑوں چاند سینکڑوں سورج

صبحِ نو کو یہ روشنی دینگے
اپنی دھرتی کو نور بخشیں گے

سیہ راتوں کو چاندنی دینگے
کچھ مری ذات پر ہے دار و مدار؟

ہاں ابھی بیج میں نے ڈالے ہیں
نہیں مانوس ابھی یہ دھرتی سے

اور ہیں اِس رمز سے بھی ناواقف　　　　کہ انہیں نشو اور نمو کے لیئے

چاک کرنے پڑینگے سینہ و دل

فصل و موسم بھی سازگار نہیں　　　　پھُول ہوں برگ ہوں کہ موجِ صبا

کون سی شے ہے جو شرار نہیں

بجلیاں اینڈتی ہیں کھیتوں پر　　　　میرے کھیتوں پہ میرے باغوں پر

تُند شعلوں کے اژدہوں کی طرح

بادلوں کی گرج سے لرزاں ہے　　　　نیلگوں آسمان کا سینہ

اور دل میری پاک دھرتی کا　　　　آندھیوں کی دھمک سے ہلتا ہے

کرنیں آتی ہیں باغبانی کو　　　　اور سُورج میں لوٹ جاتی ہیں

سرد و خوشبو ہوائیں چلتی ہیں　　　　اور اندھیروں میں ڈوب جاتی ہیں

بادل آتے ہیں آبیاری کو   اور ہواؤں کے دوش پر چڑھ کر
آسمانوں میں تیر جاتے ہیں

ہر نفس اک اُمید ہے مجھ کو   آخری وقت بھی کسی شے سے
میں کسی شے سے، نااُمید نہیں
نئی تخلیق پر یقیں ہے مجھے   نئی تخلیق ہے چھپائے ہوئے
اپنے پہلو میں باغبانوں کو
کل کی دُنیا کے پاسبانوں کو

چل مری موت چل مجھے لے چل   میں ہوں تیار، زندگی تیار
آہ وہ ساعتِ عجیب نہ پُوچھ!
جب وہ اپنے جلالِ خاص کے ساتھ   دو بدو موت کے تصوّر سے
اِن حقائق کو کہہ رہا ہوگا!

ہر طرف اک خروشِ طوفاں ہے　　زلزلوں سے زمین لرزاں ہے
شعلۂ جنگ کے تصوّر سے　　ہر نفس ہے تپاں تپاں ہستی
تیرگی کی گھٹائیں چھائی ہیں　　ہر طرف ہے دُھواں دُھواں ہستی

آہ اس دورِ علم و دانش میں　　جنگ ہی امن کی ضمانت ہے
لہلہاتے حسین کھیتوں کو　　جگمگاتے حسین شہروں کو
آگ اور خون میں ڈبو دینا
خونِ انساں سے کھیلنا ہولی　　آج بھی آدمی کی فطرت ہے

تو بھی سچّائی ہے مگر اے موت　　زندگی پر یقین ہے مجھ کو
آدمی پر یقین ہے مجھ کو

ابدی امن پر یقیں ہے مجھے

امنِ عالم کی خیر ہو اے دل | نوعِ آدم کی خیر ہو اے دل
چل مری موت چل مجھے لے چل | میں ہوں تیار، زندگی تیار

دیکھ پیڑوں کے سبز سایوں میں | میری دیوار کی منڈیروں پر
کالے کالے طویل ہاتھوں کے | چمچماتی ہوئی سنانوں کے
سبز اور زرد زرد چہروں کے | غیظ آلود بے بصر سائے

سائے سائے مہیب تر سائے

لیکن اے موت ہے یقین مجھے | سب یہ تحلیل ہونے والے ہیں

سب یہ تبدیل ہونے والے ہیں

یہی اک دن رباب و بربط پر | امن کے گیت گنگنائیں گے
اور لمسِ بہار سے اک دن | میرے نخل اور لہلہائیں گے

میرے پھول اور مسکرائیں گے

موسمِ گل ضرور آئے گا | موسمِ گل ضرور آئے گا

موسمِ گُل پہ ہے یقین مجھے!

زیست کا نقطۂ عروج ہے تو
ہر تخیّل کا آخری نقطہ
ہر تصوّر کی آخری سیما
ہر حقیقت کا آخری پردا

چل کہاں لے چلے گی موت مجھے
سفرِ آخری کو ہوں تیّار

میرے بچّے یہ لاڈلے معصوم
ابھی کم سِن نحیف و ناداں ہیں
زندگی سے ابھی نہیں واقف
رہتے آئے ہیں یہ اندھیرے میں
روشنی سے ابھی نہیں واقف
گو ہے نور اِن کی بے بہا میراث!

یہ روایات کے شکار غریب! اپنے حالات سے نزار غریب
اپنی طاقت سے یہ نہیں واقف اپنی عظمت سے یہ نہیں واقف
اپنی ہستی سے بے خبر ہیں یہ
زندگی کا دل و جگر ہیں یہ
یہ نہیں جانتے کہ ان کا خمیر بے کراں حکمتوں سے اُٹھا ہے
فکر کی رفعتوں سے اُٹھا ہے
گیان کی عظمتوں سے اُٹھا ہے

لیکن اے موت ...... ایک دن آخر ......
انہیں احساسِ زندگی ہوگا

تو ہے انجامِ زندگی لیکن
زندگی پر یقین ہے مجھ کو!

دل کے ٹکڑے یہ شاعر و فنکار — یہ مرے پھول... میرے گھر کی بہار
یہ اداکار.... عالم اور نقّاد — یہ مصوّر، مغنّی، اور رقّاص
یہ اداکار عالم اور نقّاد
صبحِ فصلِ خزاں کے پھول ہیں یہ — شبِ تاریک کے ستارے ہیں

رُخِ تہذیب کی ضیا ہی نہیں — میرے ہندوستاں کی شان ہیں یہ
انہیں آسودگی نہیں حاصل — زندگی کی خوشی نہیں حاصل

لیکن اے موت میں نہیں مایوس — مجھے وشواس ہے، بھروسہ ہے
کہ وہ دن بھی ضرور آئے گا

ہاں وہ دن بھی ضرور آئے گا

جب یہاں ہوگی عزّتِ فنکار   ہوگی یاں اہلِ علم کی پُوجا

ہر طرف ہوگا علم وفن کا عرُوج

بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں مگر   وہی پستی، وہی بلندی ہے

اک طرف خاک، اک طرف انجُم   اک طرف پھُول، اک طرف کانٹے

اک طرف بھیڑ ہے اندھیروں کی   اک طرف نُور کا تلاطم ہے

چشمہ جاری ہے زندگی کا مگر   تشنہ کامی سی تشنہ کامی ہے

ساری تعمیر حسرتِ تعمیر!   ناتمامی سی ناتمامی ہے

آخری سانس میری کہتی ہے ناتمامی تمام بھی ہوگی
کامیابی کے روپ میں اک دن اک نئی زندگی کی لے بن کر
ذرّے ذرّے میں مُسکرائے گی
چپّے چپّے میں جگمگائے گی

ابتدا پر مجھے بھروسہ تھا انتہا پر یقین ہے مجھ کو
آہ وہ ساعتِ عجیب نہ پُوچھ!
اُس کی بالیں پہ جب دمِ آخر حشر سا ہر طرف بپا ہوگا
قافلے عُمر بھر کی یادوں کے اُس کے چاروں طرف کھڑے ہونگے
سو جہاں زندگی کے خوابوں کے کارواں تشنہ کام جذبوں کے
بِھیڑ ٹوٹے ہُوئے ارادوں کی دنیا ناکام آرزُوؤں کی
اپنی فردوس کے حسیں نقشے عطرِ تخئیل میں بسے خاکے
اُس کے گھُلتے ہوئے تصوّر میں
نبض کی طرح ڈوُبتے ہونگے

اور وہ حسرت سے دیکھتا ہوگا

اور فسوں بے ہشی کا رہ رہ کر تشنۂ دید اُس کی آنکھوں میں

جال سا ایک بُن رہا ہوگا

کیا قیامت کا ماجرا ہوگا

موت اسرار، زندگی اسرار

حکمتِ مرگ و زلیست کیا کہئیے

موت اسرار، زندگی اسرار

سُن کہ اِس رمز گاہِ فطرت میں ایک رمزِ حیات اور بھی ہے

رمزِ سربستۂ بقائے دوام

ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے کہ بیک وقت گونج اُٹھّے ہیں

سازِ ہستی کے مختلف پردے

اور پردوں میں غیب کی آواز

غیب کچھ ماورائے فکر نہیں غیب بھی آدمی میں پنہاں ہے

آدمی کی پکار غیب بھی ہے

بابِ مے خانۂ حیات ہے وا دستِ سقراط میں ہے ساغرِ زہر

اور سقراط کا یہ ساغرِ زہر اپنی ہر موجِ شہد آگیں میں

دے رہا ہے اَبد کے ساغر و جام

جُنبشیں ہیں صلیبِ عیسےٰ میں — خونچکاں ساز دے رہا ہے صدا

"شہرِ ایثار کے رموز نہ پوچھ
یاں کا ہر لمحہ ہے بقائے دوام"

قبرِ لینن سے آ رہی ہے صدا — "رمزِ ہستی ہے کچھ نہ بسّرِ فنا
نوعِ انساں کی راہ میں مرنا
ہے حیاتِ ابد کا دوسرا نام"

نطقِ آزاد ہے فضائیں بلند — "موت تو ہے مجاہدوں پہ حرام"
اور باپو شہید خندہ بہ لب — گرم و تازہ لہو کی موجوں سے
لکھ رہے ہیں ابد کے دامن پر — "کیا شہیدِ وطن کو موت سے کام؟
اُس کی قسمت تو ہے بقائے دوام"

کینیڈی کے لہو کا ہر قطرہ — گونجتا ہے صدائے حق بن کر
ہر صدا محضرِ حیاتِ دوام

روحِ تاریخ دے رہی ہے صدا　　ہر نفس زندگی کا ہے فرمان
کہ جو انسانیت کی دیوی کو　　اپنی ہستی کی نذر دیتا ہے

اصل میں وہ فنا نہیں ہوتا
زندگی سے جُدا نہیں ہوتا

جاوداں ہے یہ کاروانِ حیات　　موت اس کارواں کا دُود و غبار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

ایسا انسان تھا وہ فردِ جمیل　　جس کے فکری جمال کے آگے

جس کے ذہنی جلال کے آگے

سرنگوں تھے جہاں کے صاحبِ فکر　　دم بخود تھا کمالِ نقد و نظر

ذوق اُس کا نہ تھا فقط ہمدم　　دُوسروں ہی کا جائزہ لینا

وہ محاسب تھا اپنی ذات کا بھی　　فکر کا بھی تصوّرات کا بھی

وہم کا بھی تیقّنات کا بھی

لاکھ نقّاد اُس میں پوشیدہ　　اپنی ہی زندگی پرکھنے کو

اپنی ہی آگہی پرکھنے کو

ہرِ قدم اُس کا سجدہ گاہ رہا　　اور وہ مسجودِ ہر نگاہ رہا
زندگی میں بھی وہ رہا ممدُوح　　خاک ہونے کے بعد بھی دُنیا

اُس کی عظمت کے گیت گاتی ہے
اُس کی یادوں کے آستانے پر
پھُول تحسین کے چڑھاتی ہے

ایسا انسان تھا وہ فردِ جمیل

کبھی حاجب تھی اُسکی نکہتِ گُل　　شانتی دن میں آج صبح و مسا
اُس کی جارُوب کش ہے بادِ بہار
حکمتِ مرگ و زلیست کیا کہئیے
موت اسرار، زندگی اسرار

خوابوں کے اس جہاں میں اُس نے بھی — خواب دیکھے پیمبروں کی طرح

خواب انسان کی مسرت کے — خواب انسان کی رفاہت کے

خواب عالم کے اتحاد کے خواب — خواب فردوسِ آدمیت کے

ذہنِ انساں کے ارتقاء کے خواب

خواب سنسار کی بھلائی کے — خواب انسان کی خدائی کے

خواب اِس کے کہ یہ خرابۂ غم — عشرتوں کا حسیں جہاں بن جائے

خواب اِس کے کہ جنگ جُو دنیا — معبدِ امن وصدا ماں بن جائے

شمع ہر اک قدم پہ روشن کی — عشق کی، امن کی، اخوت کی

شمعِ انسانیت کی وحدت کی
شمعِ آسودگیٔ خلقت کی

شمع اپنے حسین لبتاں سے
بیکراں جاوداں محبّت کی

خونِ دل سے دِیئے کیئے روشن
اُس نے دنیا کے سرد اندھیروں میں

اپنے بچھڑے ہوئے زمانے کو
جس قدر ہو سکی ہدایت کی

اُس نے اپنی وسیع دنیا سے
جس قدر ہو سکا محبّت کی

اور مثلِ پیمبرانِ قدیم
زندگی کے ہر ایک مرحلے پر

وہ بھی ناکام و کامیاب ہوا

راہبر اس کے خواب کل بھی تھے
آج بھی ناخدا ہیں خواب اس کے

مُنجلی ہو گئے ہیں اُس کے خواب

رہنما کل بھی تھا خیال اُس کا
آج بھی رہنما ہے اُس کا خیال

بیکراں ہو گیا ہے اُس کا خیال

کل بھی تھا شمعِ راہ آج بھی ہے
اُس کا مرغوب رہنما کردار

اس کا محبُوب رہنما کردار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار زندگی اسرار

میری آنکھوں سے اس طرح آنسو   کبھی اپنے لئے نہیں بہتے
میرے دریائے طبع سے موتی   کس کی غوّاصیوں نے پائے ہیں
میرے مجرُوح قلب سے جھرنے   کس کے احساس نے بہائے ہیں
اُس کا ماتم نہیں یہ ماتم ہے   مشترک زندگی کے جذبوں کا
مُتّحد زندگی کے خوابوں کا   مشترک لازوال قدروں کا
میں ہُوں دیوانہ اس لئے اُس کا   کہ جواھر عظیم باغی تھا
فتنہ خُو سامراج سے باغی   متفنّی سماج سے باغی
کیدِ سرمایہ دار کا دُشمن   نظمِ سرمایہ دار سے باغی

کیوں نہ اُس کے قصیدے گاؤں میں
وہ مجاہد تھا مردِ غازی تھا

جمع اس میں بغاوتوں کا جمال
سر زتا پا حسین باغی تھا

للہ الحمد میرا مشرب ہے
باغیوں کا قصیدہ خواں ہونا

للہ الحمد میرا مذہب ہے
حق پرستوں کا ترجماں ہونا

مجھے القا ہوئے ہیں نصف صدی
سر فروشانِ انقلاب کے گیت

اپنی دھرتی پہ جو نثار ہوئے
جو شہادت کا افتخار ہوئے

ہر نفس جن کا شمع آزادی
جن کے خوں سے چراغ جلتے ہیں

اُن شہیدانِ انقلاب کے گیت

مجھے الہام ہوتی آئی ہے
عندلیبانِ شعلہ بار کی حمد

ساکنانِ جہانِ دار کی حمد

منقبت لالہ گوں جوانی کی
خُوں میں ڈوبے ہوئے شباب کی حمد

نعرۂ الصبُوح ہے میرا
صُبح کے تازہ آفتاب کی حمد

سحر و شام ہے وظیفہ مرا
باغیانِ کرام کی مدحت

جس سے غدّار لرزہ بر اندام
جس سے لرزاں ہے سامراج کا دِل

اُس جنونِ مُدام کی مدحت

ہے مرا ذہن چشمۂ الہام
فکرِ القا کدہ بشارت کا

شاعری میری آئینہ خانہ
حُسنِ محبوبۂ شہادت کا

نغمہ میرا ستُونِ انجم رس
شہدائے وطن کی عظمت کا

کیوں نہ ہو مطربِ شباب ہوں میں
شاعرِ عہدِ انقلاب ہوں میں

میرے نغمات نے سکھایا ہے
جان ہاروں کو سرفروشوں کو

رسن و دار سے گذر جانا

میری آواز نے بتایا ہے
قیدِ اسرار سے گذُر جانا

اور یہ منصبِ عظیم کبھی
میں نے طوفاں میں بھی نہیں چھوڑا

آندھیوں میں چراغ میں نے جلائے
جانے کتنے جلائے کتنے بجھائے

جب چراغوں میں روشنی نہ رہی
تو لہُو سے ایاغ میں نے جلائے

میرا سوزِ نوا تھا مشعلِ راہ
سرد و تاریک شاہراہوں میں

میرا شورِ صدا تھا رجزِ عظیم
حقّ و باطل کی رزم گاہوں میں

میرے نغمے بنے ہیں بانگِ درا
عہدِ رفتہ کے کاروانوں کی

جو نفس تھا مرا ترانہ تھا
میں جوانی تھا نوجوانوں کی

دیکھ ماضی کی شاہراہ پہ دیکھ کاروانِ شباب کا وہ خرام
وقت کی طرح وہ رواں و دواں پسپا کرتا ہوا جہاں کا نظام
جس کی سرشار تیز گامی سے سُست رفتار گردشِ ایّام
ہر نفس جیسے ایک بانگِ جرس زندگی جیسے ہو فقط اقدام
وہ جوانی کا رقصِ سرمستی حسن اور عشق کا وہ وجدِ تمام
رسن و طوق اور صلیب اُٹھائے حُرّیت کے مجاہدانِ کرام
لمعۂ حُرّیت سے چہروں پر چاندنی وہ کہ گرد ماہِ تمام
دردِ انسانیت کے نشّے میں سرخوشی و خودی کے جذبے میں
وقت کے گُل فشاں دریچوں سے اک نئی آرزو کا جوشِ کلام
آ گئے آ گئے مری حُدی خوانی ایک طوفان رجز اُٹھائے ہوئے
کے شہنشاہی کی کچلتی ہوئی ظلم کی رُوح کو مسلتی ہوئی
بحر و بر کوہسار و دریا کو ایک پیغام نو سناتی ہوئی
اپنے سوزِ نوا کی لپٹوں سے پتھّروں کو کرن بناتی ہوئی

زیست کو خواب سے جگاتی ہوئی
وقت کو راستہ دکھاتی ہوئی

پیچھے پیچھے ہجومِ گُل بدناں　　نغمہ خواں خندہ بار، رقص کُناں

گلے زنجیر کو لگائے ہوئے　　اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے

آنکھ میں شعلے ہاتھ میں مردنگ　　خُون سے اپنے کھیلتے ہوئے رنگ

فرشِ گُل راہ کو بنائے ہوئے

چار سُو اک چمن کھِلائے ہوئے

مدحتِ حُسن میرا پیشہ ہے　　شاعرِ بارگاہِ ناز ہوں میں

ہوا مغنّی وفا کے نغموں کا　　مُطربِ محفلِ نیاز ہوں میں

نوشگفتہ کلی کی روح ہے جو　　اُس لطافت کا نغمہ خواں ہوں میں

کُفر و ایمان سے جو بالا ہے　　اُس شریعت کا نغمہ خواں ہوں میں

آدمی تو فقط ہے پرچھائیں　　جس کی پرچھائیں ہے یہ ماہِ تمام

اُس حقیقت کا نغمہ خواں ہوں میں

جانے کتنے دلوں کا داغ ہوں میں　　کتنے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا

اے زمانے فسُردہ خاک سہی　　میں وفا کے بجھے چراغوں کی

لیکن الفاظ میں فروزاں ہوں

تازہ تر داغ ہائے دل سے ندیم　　آج بھی سر بسر چراغاں ہوں

خاک گو ہو چکی شہنشاہی
کم نہیں سوزِ باغیانہ مرا
پھر بھی گونجیں گے انقلاب کے گیت وقت دہرائے گا فسانہ مرا
ایک دن مسکرا کے اُبھرے گا
میری ہی خاک سے زمانہ مرا
زندگی میری نغمگی کی تڑپ میرے نغمات ہیں ابد بکنار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہئیے
موت اسرار زندگی اسرار

پردہ پوش و حلیم تھا نہرو عدل کوش و رحیم تھا نہرو

دُور بین و بصیر تھا نہرو صبحِ نو کا خبیر تھا نہرو

میں ہوں پروانہ اس لئے اُس کا کہ وہ اک شمع تھا صداقت کی

جسے طُوفان بھی بُجھا نہ سکے

آندھیاں آئیں اور چھُو نہ سکیں زلزلے آئے اور ہلا نہ سکے

اور اِس شمعِ جاودانی کی

ایک ہلکی سی ضو چُرا نہ سکے

اس صفت پر میں اُسکی قرباں ہوں کہ وہ آزاد ذہن رکھتا تھا

کہ وہ نقّاد ذہن رکھتا تھا

نئی اقدارِ زندگی کا نقیب رُوحِ آزادی و خودی کا نقیب

دامِ ہائے توہّمات سے دُور
زنگ خوردہ تصوّرات سے دُور

تازہ، شاداب، گل فشاں روشن
کبھی وہ موم تھا کبھی آہن

بزم میں شمعِ انجمن کا گداز
اور میداں میں جوششِ دریا

اس کی گہرائیوں کی تھاہ نہ پُوچھ
بحر کے دل میں جھانکنے والا

حُسنِ عالم کو وہ احاطہ کئے
رُوئے عالم کے گرد اک ہالہ

سادگی بھی تھی اُس کی پُرکاری
اور پُرکاریوں میں بھولا پن

اس ادا کو غرور کہتے ہیں
اُس کے فطری جلال کے دشمن

جوہر اُس کا تھا صبرِ ایوّبی
ظرف تھا بحرِ بے کراں کی طرح

بادِ طوفاں سے ہر گھڑی مصروف
عینِ طوفاں میں بادباں کی طرح

ہوں پرستار اس لئے اس کا
کہ وہ ٹھکرا کے بندگی کے قیود

نوعِ انساں کا پجاری تھا

کتنے پودوں کو خوُن اُس نے دیا
اور پھر کتنوں کو گلاب کیا

کتنے قطروں کو کر دیا دریا
کتنے ذرّوں کو آفتاب کیا

کتنوں کو اُس نے تاج پہنائے
کتنوں کو صاحبانِ تخت کیا

اُس کی گُل چینی کا مآل نہ پُوچھ
کتنی کلیوں نے اُس کا دل توڑا

کتنے پھولوں نے اُس کے دل کو ڈسا

میں نے دیکھا ہے اُس کی آنکھوں میں
دل کے زخموں کی خوں فشانی کو

اُس کا سینہ بھی غم سے چھلنی تھا
جیسے چھلنی ہے سینۂ شاعر

اُس کے لب پر بھی مسکراہٹ تھی
جیسے شاعر کے خشک ہونٹوں پر

تیرہ و تار ہے جہاں اپنا
ہر طرف اک گھنا اندھیرا ہے

ہر طرف اک عمیق تاریکی
ہر طرف اک محیط سنّاٹا

زیست تاریک اور بوجھل ہے
سنگِ موسیٰ کی جیسے کوئی چٹان

کیوں نہ میں نوحہ گر ہوں نہرو کا
کہ وطن کی حیات تھا نہرو

کیوں اندھیرا نہ چھائے عالم پہ
رونقِ کائنات تھا نہرو

کیوں نہ ہر دل میں اُس کا ماتم ہو
دل کی دُنیا میں فرد تھا نہرو

ایک تصویرِ درد تھا نہرو

ہر روش کیوں نہ بزمِ ماتم ہو
ہر روش کی بہار تھا نہرو

کیوں نہ پژمردہ ہوں چمن کے چمن
رنگ و بو کا شباب تھا نہرو

اُس کی خاکسترِ معطّر سے
کیوں نہ خوشبو نچوڑ لے نکہت

مخزنِ عطر و رنگ تھا نہرو
زندگی کی اُمنگ تھا نہرو

اب کسی میں وہ سوزِ عشق نہیں   عاشقی کا نظام تھا نہرو
اب کسی میں وہ جذبِ حسن نہیں   کہ جمالِ تمام تھا نہرو

کیوں نہ ہوں صبح و شام اُداس اُداس
رونقِ صبح و شام تھا نہرو

کس طرح صدیوں کے اندھیرے کو   اِک کرن پاش پاش کرتی ہے
مسکرا کر دکھا دیا اُس نے

کس طرح قرنوں کی عفونت کو   آدمی عطر بار کرتا ہے
اپنے دل کا گلاب خوں کر کے
رازِ خوشبو بتا دیا اُس نے

پھول اُس کے وجود کا سایہ   اُس کے قدموں کی خاک تاجِ بہار
زندگی اُس کی اک سفرِ پیہم   موت اُس کی چراغِ راہ گذار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیے
موت اسرار، زندگی اسرار

وہ جدید ایشیا کے دل کی تڑپ — نئے مغرب کی رُوح کا نبّاض
رُوس کے ارتقا کا رمز شناس — اور اسرار دانِ واشنگٹن
اقتدارِ عظیم کا مالک — اعتبارِ عظیم کا مالک
ہند کو اُس نے اقتدار دیا — زندگی کا نیا وقار دیا
نئے آئینِ آگہی بخشے — ہمیں آدابِ زندگی بخشے
کتنے عشوہ گروں نے پھینکے دام — پا بہ زنجیر کر سکا نہ کوئی

کتنے فاتح اُٹھے زمانے میں
اُس کی تسخیر کر سکا نہ کوئی

آتے جاتے رہیں گے شام و سحر — دل پہ چھاتے رہیں گے شام و سحر
اُس کی یادوں کے قافلے پیہم
اُس کی تابندہ ذات کے سائے — اُس کی روشن صفات کے سائے

اُس کے کردار کا وقار و جلال — اُس کی انسان دوستی کا جمال
اُس کے سینے کا ادھ کھِلا وہ گلاب — اصل میں ادھ کھلا گلاب نہ تھا
خونچکاں دل کا زخم تھا تازہ — توڑ کر جو قیودِ سینہ و دل

مُسکراتا تھا اُس کے سینے پر
عطرِ انسانیت سے مہکا ہوا

مرکزِ جذبۂ محبّت تھا — قوم اُس کے وجود میں ضم تھی
اور اُس کا وجود، اُس کا وجود — مستقل قوم سے عبارت تھا
عصبیّت نہ فرقِ دین و زباں — نہ عقائد میں امتیاز اُسے

نہ مذاہب سے کوئی ساز اُسے

نہ علاقہ پرستیوں کا جنوں — نہ فسانہ کوئی، نہ کوئی فسوں
نہ کوئی شرطِ وادی و میداں — آبجو کی طرح رواں دواں
اُس نے اپنے وطن کے ورثے میں — کوئی تخصیصِ دَور و عہد نہ کی

کوئی تخصیصِ رنگ و نسل نہ کی
کوئی تنقیدِ اصل و نقل نہ کی

جو بھی ہے ہند میں وہ اپنا ہے — اپنی دھرتی ہی کا عطیّا ہے

اُس نے اپنے وطن کی ہر شے سے
پُوری سچّائی سے محبّت کی
آبرُو تھا وہ ہر روایت کی

مسجدِ شاہجہاں کا عاشقِ زار تاج کو حرزِ جاں بنائے ہوئے
اور اجنتا کے بُتکدے کا جمال اور ایلورا کا حُسنِ نقّاشی

سینۂ داغ داغ میں اپنے
سارا ہندوستاں بسائے ہوئے

اُس کا مشرب تھا جنگ باطل سے اُس کا مذہب تھا ظلم سے ٹکر
ہر تعصّب سے پنجہ کش ہونا ہر تعدّی کو روکنا بڑھ کر

وہ پرستار اپنے خوابوں کا
وہ حقائق کا رازداں تنہا
ہر طرف اک ہجومِ برق و شرار
اور چمن میں وہ باغباں تنہا
ہر طرف حادثوں کا اک محشر
اور وطن میں وہ پاسباں تنہا

اک نئے دَور کا مُدیر تھا وہ　　اک نئے عہد کا مرتّب تھا

جس نئے عہد کا مرتّب تھا　　وہ نیا عہد اُسی پہ ختم ہوا

موت نے زندگی کو لُوٹ لیا

اک حسیں آدمی کو لُوٹ لیا

آہ یہ ہولناک سنّاٹا

آہ وہ شب کا دَورِ رامش و رنگ

وہ عرُوجِ صدائے بربط و چنگ

آہ یہ خوفناک خاموشی

اور اِس خوفناک خامشی میں

مُرتعش آنسوؤں کا یہ سَیلاب　　سر پٹکتے ہُوئے دَر و دیوار

ہے زمان و مکاں کے چہرے پر　　موت کے کارواں کی گرد و غُبار

اور یہ جبرِ زندگی دیکھو　　اک طرف نالہ ہائے بُلبُل ہیں

اک طرف بج رہا ہے سازِ بہار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار زندگی اسرار

جائزہ جب لیا ہے ماضی کا
کہ ہمیں حق کی کھوج نے مارا
"ماورا" کے جنونِ بے حد میں
عام انسان تھے کہ تھے تیاگی
سب تھے ہندوستاں سے بیگانے
زیست رُومان، موت تھی رُومان
راج محلوں سے راہ جو نکلی
کوہ و صحرا سے جو ڈگر پھوٹی

ہر گرہ نے یہ کھُل کے دی ہے صدا
اتنی کی جُستجو کہ کھوئے گئے
زندگی جیسی شے کو بھُول گئے
وہ رشی تھے مُنی کہ ویراگی
سب تھے اپنے جہاں سے بیگانے
رُوح و دل میں رچے تھے افسانے
کوہ و صحرا میں جا کے ڈوب گئی
راج محلوں میں آ کے ختم ہوئی

سب کے سب فلسفوں میں ڈوبے تھے
فلسفے زندگی کو کیا جانیں

جو ہوں محدود اپنے "باطن" تک
وہ خدا آدمی کو کیا جانیں

دیکھ کر گم رہی "خداؤں" کی
ایک بندے نے رہنمائی کی

رشتہ جو ماورا سے ذہن کا تھا
اپنی ضربِ صدا سے توڑ دیا

اور اس رشتۂ تصور کو
اک نئی جستجو سے جوڑ دیا

بے خودوں کو خودی کی مے دے کر
ہندیوں کو ہزاروں سال کے بعد

ہند سے اس نے روشناس کیا

تیرہ و تار جھونپڑوں میں گیا
وہ چراغِ نظامِ نو لے کر

خشک کھیتوں میں چشمِ تر لے کر
غم میں ڈوبے دل و نظر لے کر

رنگ محلوں سے جا کے ٹکرایا
جذبۂ دردِ مفلسی لے کر

نیا احساسِ زندگی لے کر

اُسے ہر موڑ، ہر دوراہے پر
آہ کرتی ہوئی حیات ملی

زخم خوردہ نظامِ کہنہ کی
خون آلود کائنات ملی

غم و بے چارگی کی اک دنیا
بھوکے پیاسے عوام کا محشر

بھوک اور مفلسی کا اک جنگل

آخر اس مفلسی کے جنگل میں — اُس نے فردوسِ گم شدہ پالی
اور فردوسِ گم شُدہ پا کر — اُس نے صدیوں کے غافلوں سے کہا

آہ ہندوستاں سے بیگانو
اپنے ہی گلستاں سے بیگانو
یہ ہے ہندوستان پہچانو
یہ ہے "جنّت نشان" پہچانو

جس پہ صدیوں سے ناز ہے تم کو — اُسی کلچر کا شاہکار ہے یہ
جس پہ لاکھوں تہیں ہیں حکمت کی — اُسی ماضی کی یادگار ہے یہ
زندگی ہم الم نصیبوں کی — دامِ افکار میں مقیّد تھی
ہر قدم موت کے نفس کی صدا — ہر نفس اک غمِ سزا و جزا
مستقل اِک خطا کی دل میں چُبھن — مستقل اِک قصور کا دھڑکا
مستقل ایک جستجوئے نجات — مستقل اک گُناہ کا احساس
مستقل ایک سعئ کفّارہ

زندگی ہم ستم نصیبوں کی — تھی فقط ایک لفظِ بے معنیٰ

تھی فقط ایک عزمِ بے مقصد

اُس نے اِس عزم کو دیا مقصد
اُس نے اس لفظ کو دیئے معنیٰ
اُس نے دُوری کو قُرب سے بدلا
قرُب کو وصل کا لباس دیا
نفی کو دے دیا ثبات کا نام
ترک کو اختیار سے بدلا
تیاگ کو جذبۂ عمل بخشا
موت کو دے دیا حیات کا نام
حُرّیت کو دیا نیا مفہُوم
حُرّیت کو دیئے نئے معنیٰ
حُرّیت کو دیا نیا مقصد

حاکمِ وقت کا بدل جانا
تاج اور تخت کا بدل جانا
جابروں کے علَم اُتر جانا
اور بصد عظمت و جلال و ثبات
اپنا پرچم فضا میں لہرانا
کسی مِلّت کا اپنی دھرتی پر
اقتدارِ تمام پا لینا
اپنے نامعتبر ارادوں پر
اعتبار تمام پا لینا
ہے بظاہر کمالِ آزادی
لیکن اے حُرّیت کے پروانو
یہ نہیں ہے جمالِ آزادی

اُف نظامِ حیات کا یہ جلال　　یہ جلال و کمال اور یہ زوال
یہ فلک رس بلندیاں توبہ　　یہ زمیں دوز پستیاں توبہ
یہ امیری و مفلسی کا عرُوج!

حُسن و بدصُورتی کے یہ منظر　　ٹمٹماتے دیئے، دمکتے قمر
یہ لچکتے ہوئے حسیں پیکر　　یہ لباسِ حریر، یہ زیور
جگمگاتے یہ مہ جبیں مکھڑے　　مُسکراتے ہوئے حسیں چہرے
جن کی رعنائی تمنّا پر　　عشق قربان، حُسن دیوانہ
جن کی آنکھوں کی ایک جنبش پر　　جھُوم اُٹھّے نظامِ ارض و سما
رقص کرنے لگے حیات و ممات　　وجد کرنے لگے زمان و مکاں

اور یہ عریاں تنوں کا ایک ہجُوم　　اور عُریاں تنوں کے چہروں پر
دھُول یُگ یُگ کی، گرد قرنوں کی
اِن کے چہروں کے خطّ و خال ہیں ہیں　　صدیوں کے ظلم ناروا کے نشاں
اِن کے دُبلے کثیف جسموں پر　　قرن ہا قرن سے بجائے لباس
"خلعتِ فاخرہ" ہے "گردِ سفر"

جیسے بھوتوں کا قافلہ ہو کوئی | جیسے عہدِ حجر کے انساں ہوں
اِن کے بالوں میں خاک صدیوں کی | اُن کی زلفوں کے پھول لعل و گہر
اُن کے دستِ حنائی برگِ گلاب | اِن کے ہاتھوں میں مزدِ پیہم سے

سُرخ چھالوں کے خونچکاں "یاقوت"

اُن کی آنکھوں میں عشرتِ تعبیر | اُن کی آنکھوں میں صرف حسرتِ خواب
ہر نفس اُن کی اِک نئی قسمت | اِن کی قرنوں سے ایک ہی تقدیر
اک طرف آنسوؤں کے جھرنے ہیں | اک طرف مسکراہٹوں کے کنول
اک طرف ہے ہجومِ آسائش | اک طرف ہے قطار بھوکوں کی
اک طرف دَور میں ہیں ساغر و جام | اک طرف بھیڑ تشنہ کاموں کی
اک طرف ہیں جواہرات کے ڈھیر | اک طرف زخمِ دل غریبوں کے
اک طرف موتیوں کی ہیں لڑیاں | اک طرف مفلسوں کے آنسو ہیں
اک طرف سیم و زر کے رنگ محل | اک طرف جھونپڑوں کا اک جنگل

اور نکلتا ہوا دھواں اُس سے
جیسے مفلس کے دل سے دُودِ فغاں

یہ تضاد دوں کا جابرانہ نظام | جس میں صدیوں سے پس رہے ہیں عوام

اس نظامِ قبیح کا کردار ہر حقیقت سے برملا انکار

ہر توہّم پہ مستقل ایمان

اس کے افکار حاصلِ تاریخ اس کے اسرار حاملِ ادیان

اس کا ہر عہد چیستانِ ستم اس کا ہر دور ایک آہنی دام

اور اِس دام کے شکار عوام

اور یہ صدیوں سے جابری کے ہدف اور یہ قرنوں سے قاہری کے غلام

داغ ہیں دامنِ تمدّن پر علم و حکمت کا ننگ ہیں یہ لوگ

رنگ محلوں کے توشہ خانوں پر آتش افگن خدنگ ہیں یہ لوگ

طنز ہیں خود غرض سماج پہ یہ پوری تاریخِ ارتقا پہ ہیں طنز

بندوں پہ طنز ہیں خدا پہ ہیں طنز

فکرِ نہرو نے اس حقیقت کو اس سماجی تضاد کو سمجھا

اِس بلند اور پستی کو جانا مفلسی کی گرفت کو سمجھا

سب سے پہلے زبانِ نہرو سے

لفظ نکلے لباسِ معنیٰ میں

سب سے پہلے "سماج واد" کا ذکر

اُس کے ہونٹوں پہ سرد آہ بنا
سب سے پہلے غریب کا احساس
اُس کی آنسو بھری نگاہ بنا

وہ کسانوں کا ہمدمِ دیریں   کامگاروں کا دوست اور ساتھی
ان کے دُکھ درد کا انیس تھا وہ   عمر بھر اس کا یہ وظیفہ رہا

درد یہ ہر کسی سے کہتا رہا
کہ مرے گھر میں جو بلندی ہے

وہ بلندی نہیں، بلندی نہیں   موت کی خوش نما عماری ہے

شرفِ انساں پہ ضربِ کاری ہے

الاماں! الحفیظ! یہ پستی!   قبر ہے یہ ہر اک بلندی کی
اُف یہ ہیبت فزا نشیب و فراز   نہیں، یہ وجہِ امتیاز نہیں

نہیں یہ وجہِ فخر و ناز نہیں

سر بسر سوزِ انقلاب تھا وہ   مستقل درد و اضطراب تھا وہ
وہ مجاور نہیں تھا ماضی کا   اُسے امروز سے محبت تھی
مقبروں کا نہیں تھا سودائی   زندگی سے اُسے محبّت تھی

نو دمیدہ سحر کا عاشقِ زار　　　　نئے خورشید کا وہ دیوانہ

نئے نظمِ چمن کا شیدائی　　　　نئی تخلیق کا وہ پروانہ

منتظرِ نوشگفتہ غنچوں کا　　　　نئی موجِ شمیم کا شیدا

اُسے فرداسے عشقِ کامل تھا

اُس کا ایماں تھا ارتقائے حیات　　　　اُس کے تھے نبضِ کائنات پہ ہاتھ

جانتا تھا تسلسُلِ ہستی　　　　رمزِ تخلیق کا وظیفہ شناس

کہ جو بوڑھے درخت ہیں اک دن　　　　آخر اس مرغزارِ ہستی میں

ہو کے مفتوحِ مرگ گرتے ہیں　　　　اور اُن کی جڑوں کی گودی سے

نئے پودوں کی پھوٹتی ہے برات

اور نکلتا ہے باغ و صحرا میں　　　　اک نئی دل کُشا بہار کے ساتھ

تازہ دم دخترِ صبا کا جلوس

اور اُس کے جلو میں چلتی ہے　　　　زندگی اک نئے جمال کے ساتھ

اک نئی شان اور جلال کے ساتھ

سُنو اے زلیست کے پرستارو!

زلیست ہے نام جس حسینہ کا　　　　اُس کا صرف ایک ہی لباس نہیں

ایک پیکر ہے اور ہزار لباس

کس نے روکا ہے، کون روکے گا　　ذوقِ نیرنگیٔ جمال اُس کا
پستیاں ہونگی اور پہلوئے اوج　　چرخ گیتی سے آ ملیگا گلے

جھونپڑے جا ملیں گے محلوں سے
زیست کا ہے یہ فیصلہ کہہ دو
سب سے فرمانِ ارتقا کہہ دو

وہ گری رات کی سیہ دیوار　　مُسکرائے وہ صبح کے آثار
زندگی کو ذرا صدا دینا　　نوجوانی کو راستہ دینا
موت کے جان و دل کچلتا ہوا　　آ رہا ہے شباب کا رہوار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

اس طرح اُس کی فکر میں اُبھرے
نظمِ آسُودگی کے منصُوبے!

جیسے شاعر کی فکرِ رنگیں میں | اِک توانا خیال کا شعلہ
دوڑے الفاظ کے تعاقُب میں

ساز کے نغمہ ریز پردوں سے | جیسے سنگیت کی مہک پھُوٹے
جیسے نقّاش کے تخیّل میں | زندگی کا جمال مُسکائے
آگہی کا جلال مُسکائے

خواب ڈھلنے لگے حقیقت میں | خواب کھیتوں میں لہلہانے لگے
مست موجوں نے راگنی چھیڑی | خواب نہروں میں گُنگنانے لگے
بن گئے خشت و سنگ کا جوہر | دَر و دیوار و بام اُٹھانے لگے

اوجِ تعمیر کا برن لے کر　　خواب محلوں پہ مسکرانے لگے
کارگاہوں کا روپ بھر بھر کر
سازِ آسودگی بجانے لگے

کوہ و صحرا میں سو دیار ابھرے　　اور دیاروں میں لالہ زار ابھرے
ریگ زاروں میں نغمہ خواں نہریں　　اور نہروں کی مست لہروں میں
زرفشاں کھیت گنگنانے لگے

زرفشان و حسین کھیتوں میں　　گندم و جَو کی سرخ بالوں میں
گہر و لعل جگمگانے لگے

آ پڑی برق اپنے قدموں میں　　ساز و سامانِ روشنی لے کر
آسماں بن گئی زمین اپنی
انجم و ماہ آنے جانے لگے

اور پھر اک قصرِ نو ابھرنے لگا　　جس کے ضوبار و شوخ مینارے
آنکھ خورشید کو دکھانے لگے

دیکھ نہرو کے خواب کی تعبیر　　قصرِ جمہوریت کی عظمت دیکھ
قصرِ جمہوریت کی رفعت دیکھ

قدسیوں کے سلام آنے لگے

آگ اک تازہ انقلاب کی آگ   آگ جمہوریت کے جذبے کی

اُس نے سب کے دلوں میں بھر دی ہے

سب کی رُوحوں میں جذب کر دی ہے

شعلہ، یہ اشتراک کا شعلہ   کسی آندھی سے بجھ نہیں سکتا

ایک لادین راج کی بُنیاد   اِس زمیں سے اُکھڑ نہیں سکتی

خونِ دل میں ڈبو کے اے لوگو!   اِس کی بنیاد اُس نے رکھی ہے

نئے پرویز کے زمانے میں   شانِ فرہاد اُس نے رکھی ہے

تیشۂ کوہکن کے نغموں سے   گونج اُٹھا ہے دامنِ کہسار

موت پر اس کی، زندگی کو ہے رشک   سنگ ٹکڑے ہے اور تیشہ فگار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

امنِ عالم کا وہ علمبردار　　عشقِ انساں کے نشّے میں سرشار
سربسر پیکرِ رواداری　　وہ محبّت کا چشمۂ جاری
بُت شکن وہ مجاہدِ اکبر　　کانپ اُٹھا جس سے وقت کا آذر
جس نے افکارِ نو کی ضربوں سے　　قومیت کے بُتوں کو توڑ دیا

رشتہ محدود تھا جو اپنوں تک
ساری دنیا کے دل سے جوڑ دیا

اپنی فکرِ جمیل سے اُس نے　　نئی تہذیب دی سیاست کو
اپنے کردار کی بلندی سے　　نئی ترغیب دی سیاست کو

اُس کے انجم فشاں تبسّم نے — دُور قوموں کی تیرگی کر دی
جن کی قسمت فقط اندھیرا تھا — اُن کی رُوحوں میں روشنی کر دی
اپنے شیرین و نرم نغموں سے — پتھّروں کو گلاب اس نے کیا
شاخِ تازہ کو لمس سے اپنے — نغمہ پیرا رباب اُس نے کیا
امن کے دیوتا جواھر نے — اس تصوّر ہی کو کچل ڈالا
کہ لڑائی ہے ارتقا کی کلید — اور ایٹم حیات کا زینہ

ٹینک ہیں شش جہات کا زینہ

جنگ امرت ہے جنگ آبِ حیات — جنگ ہے آدمی کی راہِ نجات
جنگ افلاس کا علاج بھی ہے — جنگ تریاقِ سامراج بھی ہے
اِس مفکّر نے اِس مبصّر نے — نقشۂ فکر ہی بدل ڈالا
اپنے سوزِ جگر کے پرتو سے — تیغ کو موم کر دیا اُس نے
تُند شعلے کو قطرۂ شبنم — خار کو برگِ گُل میں ڈھال دیا
اُس کے فیضانِ نرم خوئی سے — سنگ میں پھُول مسکرانے لگے
رقص کرنے لگی خزاں میں بہار — برف میں نخل گنگنانے لگے

ریگ میں مسکرائی صبحِ بہار

جابر حیّت کی رُوح کانپ اُٹھی　　ہوگئی تیز وقت کی رفتار
اُسے جینا تھا اور جینا تھا　　ہے ہر اک دل کی آج بھی یہ پُکار
حکمتِ مرگ و زلیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

دینِ انسانیت کا حامی تھا　　اُنسِ عالم کا وہ پیامی تھا
فرقہ و ذات سے بلند تھا وہ　　مذہب اور قوم کا اسیر نہ تھا
نہ تھی کچھ شرطِ شرقی و غربی　　نہ عرب اور عجم کی قید کوئی
ذوقِ انسان دوستی اُس کا　　ہر کسی کو گلے لگاتا تھا
دل کے ایوان میں بٹھاتا تھا

دردِ انسانیت لئے دِل میں　　سر میں دُنیا کی ہمدمی کا جنُوں
آرزوؤں کا اک جہاں دل میں　　لاکھ خوابوں کے کارواں دل میں
جتنے ویرانے ہیں چمن بن جائیں　　جشن گاہِ گل و سمن بن جائیں
انجمن میں جو آ نہیں سکتے،
آئیں اور صدرِ انجمن بن جائیں

کاٹ کر حلقۂ سلاسل کو　　جتنے محکوم ہیں وہ حاکم ہوں

جو نگاہیں اُٹھا نہیں سکتے　　وہ نظر سے نظر ملا کے چلیں
سرنگوں ہیں جہاں میں جو قومیں　　فخر سے وہ بھی سر اُٹھا کے چلیں
بے بسوں کی بھی ایک ہستی ہو　　وہ بھی آزاد ہوں صبا کی طرح
اُن کے گھر بھی ہوں آسماں پرداز　　اُن کے آنگن بھی ہوں فضا کی طرح
وہ بھی سمجھیں کہ ہم بھی انساں ہیں　　نازِ ہستی ہیں فخرِ دَوراں ہیں
دردِ عالم تھا اُس کے سینے میں　　کتنے طوفاں تھے اک سفینے میں
شام آزاد ہو، سحر آزاد　　شمس آزاد ہو، قمر آزاد
قلم آزاد ہو، زباں آزاد　　فکر آزاد ہو، بیاں آزاد

جذبۂ حرص و آز مٹ جائے
نسل کا امتیاز مٹ جائے
رنگ کا ساز باز مٹ جائے

ایک ہی ساز دہر میں گونجے　　ایک ہی نغمہ ہو دیار دیار
خونِ دل سے جو ڈالے جاتے ہیں　　کہیں مٹتے ہیں پھر وہ نقش و نگار
نہ کرے زندگی وفا نہ کرے　　موت ڈالے حجاب اُن پہ ہزار
کل کے نقّاش کی امانت ہیں　　رمز آموز اُس کے نقش و نگار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

اُس کی خوش بختیوں کا کہنا کیا
اُس نے افریشیا کی دھرتی میں بیج جمہوریت کے بوئے ہیں
اور بیجوں کو سخت دھرتی سے اُس نے ہنستے ہوئے بھی دیکھ لیا
نخل بنتے ہوئے بھی دیکھ لیا
اور بادِ صبا کی گودی میں لہلہاتے ہوئے بھی دیکھ لیا
اب یہ پودے بہاریں اک دن لالہ و گُل پہ خندہ زن ہونگے
اور تناور درخت کی صورت بڑھ کے سارے جہاں پہ چھائیں گے
اُس کی خوش بختیوں کا کہنا کیا؟
ابدی ہے سمن سمن کی بہار جاوداں ہے چمن چمن کی بہار
ضامنِ فصلِ گُل خزاں اُس کی موت گُل پوش، زندگی گلبار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

ہائے مجبوریاں جو اِدھر کی — آہ وہ حائلات کا عالم
شور کرتی ہوئی وہ تاریکی — جیسے طوفاں کی رات کا عالم
ہر طرف اُس کی راہ میں حائل — اِک عُمق، اک خلیج، ایک پہاڑ
کبھی فرقہ پرستیوں کا جنوں — کبھی نفرت کے آتشیں کہسار
کبھی ملکوں کے قلب میں پیوست — خون آلود خنجرِ تقسیم
بربریت کا منظرِ خونیں — کبھی جلتے مکاں کبھی مقتل
زخم وہ چہرۂ تمدّن کے — شہر جیسے نہیں، یہ ہیں جنگل
کبھی دریائے خونِ انسانی — کبھی آتش کدے عقیدوں کے
رُوحِ تخریب کا وہ جبر و غضب — جنگ کے دیوتا کا قہر و جلال
امتیازاتِ رنگ و نسل و وطن — سو حجاباتِ رنگ و نسل و وطن

ہائے دشواریاں جو اُبھر کی | دین حائل کبھی، کبھی دُنیا
اللہ اللہ رے اُس کی پامردی | بحرِ خوں میں بھی ڈگمگائے نہ پاؤں
ڈھل گئی تیز دُھوپ آخرِ کار | اُس نے بخشی جہاں کو امن کی چھاؤں
اُس کے اشکوں سے جگمگا اُٹھا | رُخِ وحشت پہ غازۂ تہذیب
آخر اُس کی شرافتِ احساس | امنِ عالم کی بن گئی ترغیب
تازگیٔ دلیلِ نہرُو سے | کھُل گئیں بندشیں روایت کی

گرہیں کھُل گئیں حقیقت کی

کنولوں پر پھر شگفتگی آئی | پھر گلابوں پہ تازگی آئی
پھر دہکتے ہوئے شراروں سے | نئی اُمید کا کنول پھُوٹا
اُس کے افکارِ امن پرور نے | دہر کو اِک نیا شعُور دیا
اُس نے جامِ بقائے باہم سے | نئے میخانے کی بِنا رکھ دی

بادۂ نَو کا دَور چلنے لگا

بادۂ اتحّاد سے اُس نے | امتیازات کو بہا ڈالا
جو حجابات اُٹھ نہ سکتے تھے | اُن حجابات کو اُٹھا ڈالا
اُس نے تاریخِ عہدِ حاضر میں | اک نئے باب کا اضافہ کیا

اُس نے مشرق کی کجکلاہی میں
طُرّۂ ناز کا اضافہ کیا

خاک کو بخش دی بلندیٔ چرخ — اور فسُردہ گلوں کو تاجِ بہار
خاک ہو کر بھی ہے وہ رُوحِ چمن — آج بھی اُس کے پھُول، اُس کی بہار

حکمتِ مرگ و زلیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

کم سوادی کو اپنی کیا کہیئے — ہم زمانے سے کٹ کے جیتے تھے
پی کے ہم میکشوں سے چھُپتے تھے — چھُپ کے ہم میکشوں سے پیتے تھے
لیکن اِس ساقیٔ اخوّت نے — میکشانِ جہاں کی محفل میں
صدرِ محفل بنا دیا ہم کو

تشنگی کیا ہے، کیا ہے سیرابی — کیا ہے محرُومی، کیا ہے کم یابی
کیف و کم سب بتا دیا ہم کو

فکر و اقدارِ عالمی دے کر — کم نگاہوں کو دی نظر اُس نے
بھر دیئے دل میں بحر و بر اُس نے

خمستانِ جہاں کا تھا ساقی — حاصلِ ساغر و سبُو وہ تھا

تھا نہ اپنی ہی آن بان فقط　　ایک عالم کی آبرو وہ تھا

گم رہوں ہی کا وہ نہ تھا رہبر　　رہنماؤں کا رہنما وہ تھا

خود پرستوں کا رہنما ہی نہ تھا　　ناخداؤں کا ناخدا وہ تھا

جیسے ہی اس حسین رباب کے تار　　دستِ مضرابِ مرگ نے توڑے

کسی بربط میں نغمگی نہ رہی

جیسے ہی صبحدم یہ سرخ گلاب　　سوزِ بادِ فنا سے مرجھایا

کسی گُل میں شگفتگی نہ رہی

صبحدم جیسے یہ چراغ بجھا　　بزمِ عالم میں روشنی نہ رہی

دہر میں بچھ گئی صفِ ماتم

ایک آنسو میں ڈھل گیا عالم

شورِ گریہ اُٹھا دیار دیار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

یُوں جیا اس سماج میں نہرُو جیسے دلدل میں اک شگفتہ کنول

جیسے شعلوں میں پھُول جُوہی کا

ریگ زاروں میں جیسے نخلِ گلاب جیسے پُرشور آندھیوں میں چراغ

جیسے موجوں میں ڈولتی کشتی بحرِ ذخّار میں عظیم چٹان

جیسے طوفاں میں روشنی کا ستون جیسے پتھّر میں زعفران کا پھُول

خاک میں جیسے قیمتی گوہر جیسے سنگِ سیاہ میں سونا

جیسے بنجر زمیں میں کھِل اُٹھّے سبز و شاداب لہلہاتا چمن

جیسے آتش زدہ بیاباں میں ہو نمُودِ گلاب و سرو و سمن

گرم موسم میں جیسے ابرِ بہار

جیسے ویراں کھنڈر سے پھُوٹ پڑے نغمۂ موجِ قلقلِ مینا

نغمۂ آبشار سے گونجے جیسے تشنہ سراب کا سینا
جیسے کشتِ گلاب بن جائے کرۂ آفتاب کا سینا
نہرو انساں تھا اور انساں میں خامیاں کچھ نہ کچھ تو ہوتی ہیں
جس میں خامی نہ ہو وہ انساں کیا

جس میں کانٹے نہ ہوں گلاب نہیں ہو جو بے داغ ماہتاب نہیں
غلطی ارتقا ہے صحت کا خامی تکمیلِ آدمیّت ہے
عملِ نیک جس کی ہو بنیاد ایسی خامی کمالِ صحت ہے
کون ہے اس جہانِ ناقص میں جس کے عادات سب کے سب ہوں پسند
صرف اتنی سی بات کافی ہے شرف و مجدِ آدمی کے لئے
کہ معائب ہوں اُس میں گنتی کے
اور اُس کی تو خامیاں اے دوست جبرِ ماحول کا نتیجہ تھیں
اُس کی دُنیائے ناتمام کا عکس
پست وادنیٰ سماج کا پرتو جس کی رگ رگ میں خونِ فاسد ہے
اُس شنیعہ سماج کا پرتو
جس کے افراد ذوقِ صرصر میں تازگیٔ صبا کو ٹھکرا دیں

گمرہی کے غرورِ بے حد میں
راہ اور رہنما کو ٹھکرا دیں
ناخدائی کے زعمِ باطل میں
کشتی و ناخدا کو ٹھکرا دیں
سر اُٹھائے کبھی جو اِن کا جنوں
آدمی کیا خدا کو ٹھکرا دیں

خونِ فاسد نہ بہ سکے گا کبھی
نشترِ انقلاب سے پہلے
یہ اندھیرا نہ چھٹ سکے گا کبھی
خندۂ آفتاب سے پہلے

اس تصوّر میں وہ روانہ ہوا
نئے آفاقِ نور کی جانب
نئے خورشید کے تجسّس میں
یہ تجسّس ہی اُس کی خامی تھا
لیکن اے صبحِ نَو کے دیوانو!
جستجو مقصدِ عظیم و جلیل
آرزو بے کراں و عمر قلیل

گو نہ تھی فرصتِ حیات اُسے — پھر بھی دُنیا کو زندگی بخشی
بے زبانوں کو دی زباں اُس نے — بے نواؤں کو اک نوا بخشی
سازِ بشکستہ کو صدا بخشی

تیرہ و تار اپنی دُنیا کو — نئے خورشید کی ضیا بخشی
ابر آلود صبح کو اُس نے — روشنی کی حسیں ردا بخشی
کر دیا فاش سِرِّ تاریکی
اُس کا سب سے بڑا گُنہ تھا یہی

اُس کی جمہوریت پرستی دیکھ!
بادۂ اقتدار پی کر بھی — وہ نہ قیصر تھا اور نہ آمر تھا
سر پہ کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے — جادۂ فقر کا مسافر تھا
دیکھ اُس کا یہ ظرفِ مستی دیکھ

مُنکروں کے ہجوم میں تنہا — رُوحِ ایمان تھا یہ کیا کم تھا
وحشت و جہل کے تلاطم میں — شمعِ عرفان تھا یہ کیا کم تھا
بے یقینی کے گھور اندھیرے میں
نجمِ ایقان تھا یہ کیا کم تھا

غربت و بے کسی کی راہوں کا ساز و سامان تھا یہ کیا کم تھا

صاحبِ دیر ہو کہ شیخِ حرم سب کا ایمان تھا یہ کیا کم تھا

بحرِ ناممکنات میں لوگو! شمعِ امکان تھا یہ کیا کم تھا

دیکھ کر اپنی ناتمامیٔ شوق خود بھی حیران تھا یہ کیا کم تھا

عہدِ حاضر کا دیوتا ہو کر

صرف انسان تھا یہ کیا کم تھا

نازشِ روزگار اور تنہا مسکراتی بہار اور تنہا

لاکھ طوفان دل میں اور خاموش مستقل بے قرار اور تنہا

کبھی مسرور اور کبھی مغموم کبھی بے اختیار اور تنہا

کون ہوتا ہے رازدارِ جنوں دامن تار تار اور تنہا

ترکِ دنیا ہے اور کس کا نام وارثِ اختیار اور تنہا

اور کس شے کو تیاگ کہتے ہیں

صاحبِ اقتدار اور تنہا

اللہ اللہ وقارِ آزادی اللہ اللہ خودی جوہر کی

اللہ اللہ یہ آبرو کا خیال

تاج ایلورا اور اجنتا پر
وقت کے سائے بھی نہ پڑنے دیئے
جبرِ حالات نے ہزار کہا
اُس نے وابستگی قبول نہ کی
غیر وابستگی کی حکمت کو
اک عقیدے میں اُس نے ڈھال دیا
اور اُسے مجلسِ عقائد میں
ایک اُونچا مقام بخش دیا
جاوداں احتشام بخش دیا
بے خودوں سے یہ کہہ دیا اُس نے
کہ "خودی" بیچنے کی چیز نہیں
لاکھ اندیشۂ فنا ہو مگر
آبرو بیچنے کی چیز نہیں
آج بھی کشمکش کے عالم میں
زندگی کے ہجومِ پیہم میں
شمعِ ہر رہگذر ہیں یہ افکار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

نقشِ دستور، قصرِ آزادی اسی معمار کے تخیّل کی
مُسکراتی ہوئی حقیقت ہے
اسی فنکار کے تصوّر کا انعکاسِ جلال و عظمت ہے
یہ بلندیٔ قصرِ آزادی کہکشاں بوس یہ کلس اِس کے
اُس کی رفعت کا پرتوِ روشن
اُس کی پروازِ فکر کا سایا
اُس کے قامت کی ایک پرچھائیں
لالہ و گُل پہ ہے نکھار ایسا جیسے آئی ہے غُسل کر کے بہار

ذرّے ذرّے پہ یہ فسونِ شباب   رُوئے افسردگی پہ یہ تب و تاب

اُسے اہلِ سلف سے ورثے میں   سینکڑوں سال کی غلامی ملی
نارسائی و ناتمامی ملی
مگر اِس عہد ساز رہبر نے   مگر اِس قائدِ مخیّر نے
ہمیں ورثے میں دی ہے آزادی
ایک آزاد مملکت دی ہے   کہیں بڑھ کر اشوکِ اعظم سے
متحدّ ایک سلطنت دی ہے
فرقہ و ذات کی حدیں توڑیں   اک نئی قوم کی بنا رکھ دی
مُردہ اور منتشر عناصر کو   وحدتِ زندگی عطا کر دی
اک نئے دیس کی بِنا رکھ دی
اک نئی نسل کا تبسّم شوخ   افقِ زیست پر اُبھرنے لگا
جتنا دل خوں کیا جواہر نے   نقش اُتنا ہی یہ نکھرنے لگا
اک نئی زندگی طلوع ہوئی   اک نیا عہد آشکار ہوا
ہم سرِ گُل ہیں، خار گلشن ہیں   شوُدر ہیں حلقۂ برہمن ہیں

ذرّے کو تختِ آفتاب دیا　　پیری کو منصبِ شباب دیا
کھُل گئے مندروں کے دروازے　　صدیوں کے جذبۂ عبادت پر
نسل ہا نسل کی محبت پر
قرن ہا قرن کی جُدائی پر　　بے خداؤں کی اک خدائی پر
جو برہمن کے کید میں تھا اسیر　　صدیوں کے بعد مل گیا وہ خُدا
قرنوں کے بعد مل گیا وہ خُدا
کھُل گیا ہر دریچۂ امکاں　　صبحِ نو کی نسیمِ نغمہ کُناں
دلِ انساں میں گنگنانے لگی
رُوحِ باپُو کی مُسکرانے لگی
"منّو" کا ذوق تھا فقط دوری　　اور "نہرؔو" کا دین عشقِ عوام!
وصل کو اُس نے فصل میں بدلا　　فصل کو اِس نے وصل میں بدلا
نہیں آسان منصبِ وارث　　اپنی ہستی مٹانی پڑتی ہے
جان و دل خاک کرنے پڑتے ہیں
شکرِ احساں یُونہی نہیں ہوتا　　اُس کے ورثے کا انتظام کرو
کچھ تحفّظ کا اہتمام کرو

ورثہ دُنیا میں چھن بھی جاتا ہے
ہوشیار آس پاس سے ہُشیار

زندگی کیا ہے حُرّیت کا فروغ
موت کیا ہے غلامئ کردار

پاسباں دوسرے نہیں اس کے
ہم ہیں اپنے وقار کے مختار

جس نے ہم کو حیاتِ نو بخشی
ہے تصوّر میں آج بھی زندہ

اور زندہ ہے جو تصوّر میں
جاوداں ہے وہ مر نہیں سکتا
موت اُس کی حیات کا سایا

دیدہ و جاں میں جاگتا ہے وہ
دل کی دُنیا میں چل رہا ہے وہ

شرحِ مرگ و حیات کیا کیجے
موت بیدار، زندگی بیدار
حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے
موت اسرار، زندگی اسرار

نقش شوخی کا شاہکار سہی
پھر بھی یہ ناتمام و خام سا ہے

خال و خط پر شباب ہے لیکن
خال و خط وجد میں نہیں آئے

قافلہ سو رہا ہے رنگوں کا
ابھی رقصاں نہیں ہیں نقش میں رنگ

ہے عدم میں سجا ہوا ارژنگ

پائے صہبا میں ہیں سلاسل کیف
کیف ہے قید جام و ساغر میں

غمزہ ہے خوابِ ناز میں مدہوش
رقص سویا ہوا ہے پیکر میں

راگ کھوئے ہوئے ہیں تاروں میں
ابھی نغمے حجابِ ساز میں ہیں

لالہ و گل کے رنگ و بو پہ نہ جا
سو چمن سینۂ ہزار میں ہیں

بوئے گُل ہو کہ نالۂ بُلبُل　　سب ابھی پردۂ بہار میں ہیں
ابھی نکہت ہے قیدِ غنچوں میں　　ابھی گم ہے نسیم پھولوں میں

پھر بھی گاتی ہے زندگی ہر سُو
مست ہو ہو کے نغمۂ نہرو

اُس کے منصوبوں کا جمال نہ پوچھ　　آرزوؤں کے خدّ و خال نہ پوچھ
ہے نیا ہند یادگارِ عظیم　　اُس کے عہد آفریں ارادوں کی
روئے صنعت کا یہ جمال و جلال　　ہے ضیا اُس کے روئے ارماں کی
کارخانوں کے نغمہ زاروں میں　　نغمہ خواں جس قدر مشینیں ہیں
اُن مشینوں کے پُرزے پُرزے میں　　صرف جشنِ تصادمات نہیں

صرف عیشِ تعلقات نہیں
بلکہ یہ جذبۂ تشکّر میں　　رقص کرتی ہیں گُنگناتی ہیں
اپنے خالق کی حمد گاتی ہیں

ضربِ آہن نہیں ہے نغمہ کُناں　　یہ جواہر کے دل کی دھڑکن ہے
لمس سے اُس کے روحِ آہن میں　　شعلۂ بے کراں بھڑکتا ہے
پیکرِ سنگ کے رگ و پے میں　　اُس کی ضربت سے دل دھڑکتا ہے

ہر شرر ایک جستِ روشن ہے — کہ زمیں اپنی ارضِ طوُر بنے

ہر شبِ تار صُبح ہو جائے — ہر اندھیرا شعاعِ نوُر بنے

کارگاہوں کے گوشے گوشے میں — کارفرما ہے حسرتِ نہروؔ

پھوُٹی پڑتی ہے نکہتِ نہروؔ

قصرِ صنعت کے لالہ زاروں میں — ہو رہا ہے خودی کا جشنِ بہار

نشہ آور گھنے اندھیرے میں — صبح نے کھول دی ہے زلفِ نگار

قصرِ صنعت کے پیچ و خم میں نہاں — امنِ عالم کی شاہراہِ حسیں

قصرِ صنعت کے آستانے پر — ایک عالم جُھکا رہا ہے جبیں

قصرِ صنعت نکھرتا جائے گا

یہ نیا تاج اُبھرتا جائے گا

پے بہ پے شعلہ بار یہ ضربیں — نئے سنگیت کے شرارے ہیں

پھینکتے ہیں جو اپنا دامِ فسوُں — ماہ و خورشید کے دیاروں پر

اور یہ دریائے سُرخ آہن کا — نئے گنگ و جمن کا قاصد ہے

اک نئے عہد کا مشاہد ہے — اک نئے عصر کا مجاہد ہے

سرخوشی و خودی کا مظہر ہے — نئے احساس کا پیمبر ہے

اِس کی موجوں میں عاشقوں کا لہو
اِس میں جولاں مجاہدوں کا لہو

اس میں شاہیں کے شہپروں کی تڑپ
اِس میں پوشیدہ مورچوں کی قطار

اِس میں تیغ و تفنگ، ریل، جہاز
پھر بھی ہر شے ہے امن کی غمّاز

اِس میں کِھلتے ہیں شانتی کے کنول
مُسکراتی ہے اس میں صبحِ بہار

ضربِ آہن کی نغمگی مت پُوچھ
سازِ خودداریٔ عوام ہے یہ

آہنی دَور کا کلام ہے یہ

اِس کے آہنگ کے دریچوں سے
جھانکتا ہے جمالِ نہؔرُو کا

گونجتا ہے مقالِ نہؔرُو کا

کارواں میرِ کارواں سُن لے

جو جہاں ہے وہاں، وہاں سُن لے

رودِ گنگا کے پاک ساحل پر

اب نہ اُترے گا کارواں کوئی

اور اب اِس کی پاک موجوں کو

کر سکے گا نہ خونچکاں کوئی

اب سمندر ہے رودِ گنگ نہیں
اب نہ طُوفاں اُٹھا سکے گا کوئی

جاگ اُٹھی جاگ اُٹھی خودی اپنی   اب نہ فتنے جگا سکے گا کوئی

اُفقِ صبحِ نو کے جلووں کی   تاب ہرگز نہ لا سکے گا کوئی

علم پر جہل اب نہ چھائے گا   اب نہ ہو گا درندگی کا رقص

خوں کی پیاسی شہنشہی کا رقص

بادِ صرصر ہو وہ کہ موجِ صبا   یا ہو بادِ جنوب کا جھونکا

ہو وہ پُروا کہ بادِ مغرب ہو   یا ہو بادِ شمال کا شعلہ

اب نہ اس باغ کے گلابوں سے

اُن کی خوشبو چُرا سکے گا کوئی

کارواں میرِ کارواں سُن لے

جو جہاں ہے وہاں وہاں سُن لے

ذرّہ ذرّہ ہے دیدۂ بیدار

اپنے گلشن کا باغباں ہے وہی   آج بھی میرِ کارواں ہے وہی

اُس کے نقشِ قدم ہیں اب سالار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

بُجھ گئی شمع نُور باقی ہے

نُورِ یہ دور، دور باقی ہے

نہ وہ محفل ہے اور نہ وہ ساقی — جاوداں اک سُرور باقی ہے

نہیں خورشید لیکن اب بھی ہیں — ہر سُو اُس آفتاب کی کرنیں

گو نہیں وہ گلاب پھر بھی ہے — ہر طرف اُس گلاب کی خوشبو

پتے پتے میں اُس کی رعنائی — غنچے غنچے میں اُس کی زیبائی

لالہ زاروں میں گل عذاروں میں — ہر طرف اُس گلاب کی خوشبو

ہر سُو اُس آفتاب کی کرنیں

گلشن و کوہسار و وادی میں — اُس کے سایوں کے ابر محوِ خرام

اُس کی یادوں کی گونج سے آباد — لاکھ ویراں گھروں کے صبح و شام

سرد و خاموش برف زار ولر ہیں
اُس کی شمعِ خیال نور فشاں

ریگ زاروں کے گرم سینے میں
اُس کے انفاس کی نسیم رواں

لہلہاتے یہ خوبصورت کھیت
مُسکراتے یہ خوبصورت کھیت

اُن میں گندم کے زر فشاں خوشے
اور اِن زر نگار خوشوں میں

ضو چکاں اور گہر فشاں دانے
نہیں دانے حسیں نگینے ہیں

جو نگینہ ہے نقش ہے اُس کا

جس قدر بہ رہے ہیں یاں دریا
رقص کرتے ہوئے مچلتے ہوئے

گہر و سیم و لعل اُگلتے ہوئے
جوشِ فیضان سے اُبلتے ہوئے

راہ کی تشنگی بجھاتے ہوئے
جنگلوں کو گلے لگاتے ہوئے

خشک اور اونگھتے درختوں کو
فصلِ گُل کا پیام دیتے ہوئے

اپنی موجوں کے جام دیتے ہوئے

دلِ فیّاض کی طرح شب و روز
دولتِ بے کراں لٹاتے ہوئے

موتیوں کا جہاں لُٹاتے ہوئے

ویاسؔ، گوداوریؔ، مہانّدیؔ
رودِ جہلمؔ، چنابؔ اور گنگاؔ

کرشناؔ، تاپتیؔ، توِیؔ، اِندسؔ
نربداؔ، برہم پترؔ اور جمناؔ

سینہ کوب ان کی پاک موجوں میں　　اُن کی صد سینہ چاک موجوں میں

صرف اُس لالہ رُخ کی خاک نہیں

قطرے قطرے میں جذب ہے لوگو　　پُورے ہندوستان کی عظمت

عصرِ حاضر کا کُل جمال و جلال　　اور سارے جہان کی عظمت

اور سارے جہاں کا حسُن و وقار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

منظرِ زیست سے جُدا ہو کر　　زیست پر اور چھا گیا نہرُو

خاک ہو کر بھی وہ فنا نہ ہوا　　رُوح و دل میں سما گیا نہرُو

حرم و دیر ہو کہ ویرانے　　کوہ و صحرا ہوں یا دیار و چمن

جھونپڑے ہوں کہ قصر ہوں ہر جا　　اُس کی یادوں کے ہیں دیئے روشن

ہر طرف اُس کی بُوئے پیراہن

ہر طرف اُس کی یاد کی خوشبو

ہر طرف اُس کی زندگی کی مہک　　جیسے ہر شے میں چل رہا ہے وہ

شمع کی لَو سے پردۂ گل سے

مُسکراتا نکل رہا ہے وہ

ہر روش پر خرام کا نغمہ
ہر شگفت اُس کے نقشِ پا کی صدا

نو شگفتہ حسیں گلابوں پر
ہر طرف اُس کا مہ جبیں سایہ

باغ باغ اُس کا ذوقِ گُل چینی
شاخ شاخ اشتیاق پھُولوں کا

کہ ہمیں بڑھ کے توڑ لے نہرُو

اپنے سینے کا ماہتاب بنائے
اپنے پیکر کی خوشبوؤں میں بسائے

جس کے اِس طرح نقش بکھرے ہوں
جس کی اِس طرح یاد چھائی ہو

موت اُس کی نظر کا دھوکا ہے

جس کی نکہت سے مست سرو سمن
جس کی خوشبو سے بس رہا ہے چمن

پھُول وہ پھول وہ چراغِ بہار
جس کی ضو سے دمک رہے ہیں گلاب

جس کی تابش سے ہے خزاں بھی بہار
پھُول وہ کب چمن میں مُرجھایا

پھُول وہ آج بھی شگفتہ ہے

ہر طرف اُس کی بُوئے پیراہن

ہر طرف اُس کی یاد کی خوشبو

یاد بکھری ہوئی ہے کھیتوں میں
یاد مہکی ہوئی ہے باغوں میں

کلیوں میں نو شگفتہ پھولوں میں | چاند میں قوس میں ستاروں میں
یادِ گونجی ہوئی ہے سازوں میں | یاد بکھری ہوئی ہے نغموں میں
ہر طرف یاد اُس کی جانِ حیات | ہے سمائی ہوئی عناصر میں

ہے سموئی ہوئی مناظر میں
ہر طرف اُس کی یاد کی خوشبو

شاعروں کی نوا میں یہ خوشبو | نغمہ گر کی صدا میں یہ خوشبو
اہلِ تدبیر کے تدبّر میں | نفسِ فکر بن کے اُبھری ہے
اور خطیبوں کے گرم خطبوں میں | قوتِ ذکر بن کے اُبھری ہے
کارگاہوں میں شاہراہوں میں | اُس کے فکر و عمل کے جلوے ہیں
دفتروں اور درس گاہوں میں | کارگر اب بھی اُس کے جذبے ہیں
تھا وہ کھنڈروں میں بادشاہی کے | خلدِ جمہور کی نسیم رواں
نئی روئیدگی کا خندۂ شوخ | نئے دیوار و بام و در کی اُٹھان
نئے محلوں کے خواب کی تعبیر | نئی فصلِ بہار کا اعلان
اک نئی زندگی کا کشفِ عظیم | ایک تازہ نظام کا عرفان

خس و خاشاک کے کلیجے میں

اک مہکتے گلاب تھا نہرو

جہل وافلاس کے اندھیروں میں

علم وآسودگی کا سُورج تھا

تھا وہ اُس چشمۂ حسیں کی طرح
جو کسی چرخ بوس چوٹی سے

کوہ کے پیچ وخم کچلتا ہوا
ریگ زاروں کے دل میں گرتا ہے

خاک کی تشنگی بجھانے کو

خاک میں گلستاں کھِلانے کو

جیسے دہقاں کے دل میں صبح ومسا
ابرِ باراں کی حسرتوں کا ہجُوم

جیسے مالی کی روح میں دن رات
آرزو رنگ رنگ پھُولوں کی

خشک سالی میں جیسے کوئی کسان
پہلی برکھا کے انتظار میں ہو

جیسے معمار کے تصوّر میں
نو بہ نو بام و در کی اک دنیا

روِشں وآبجُو کا اک طوفاں

خوں میں ڈوبی ہوئی ہواؤں میں
آگ اگلتی ہوئی فضاؤں میں

اُس کی یادوں کے پھُول مہکے ہوئے

اُس کی یادوں کے ساز گونجے ہوئے

جنگ کے مورچوں پہ اُس کا جلال — عسکریت ہے اُس سے لرزیدہ

آج بھی نغمہ ریز اُس کی صدا — گو نجتا نعرۂ شجاعت ہے

آج بھی ہر شدید اُلجھن میں — ناخنِ فکر اُس کا عقدہ کُشا

وہ عظیم اجتماع کی آواز — وہ کروڑوں دلوں کا شورِ صدا

دلِ انساں کی مستقل دھڑکن — چشمِ انسانیت کا اشکِ رواں

اُس کی پرچھائیں تربتِ شاہیں — اس کا سایہ عقاب کا مدفن

ایک تنبیہہ جنگ بازوں کو — غیرتِ زندگی کی اک للکار

وہ اندھیرے سے نُور کی پیکار

زندگی ہی نہ تھی جہادِ عظیم — موت بھی ہے مجاہدہ بکنار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

امن سوزوں کے شہرِ ظلمت میں — عافیت کی لطیف و پاک کرن

جیسے قصرِ سیاہ و ویراں میں — لعل و گوہر کی پچّہ کاری ہو

جیسے تاریک رات میں ہمدم — چاند تاروں کی چیتر کاری ہو

جیسے سُنسان کوہ و صحرا میں — شہریت کا حسین و شوخ خیال

نیم وحشی سماج میں جیسے — مدنیّت کی آرزوئے کمال
جاہلیّت کے شورِ بے حد میں — علم و عرفاں کا نغمۂ الہام
سر سے پا تک وہ جذبۂ ایماں — سر بسر عدل و رحم کی تصویر
اک شہادت حیاتِ صادق کی — اک صداقت کی بولتی تصویر
زندگی کی مسرتوں کا جمال — رُوحِ انسانیت کا جاہ و جلال

قلبِ یزداں کی آرزوئے کمال

پات پات اُس کے پھول کی خوشبو — پھُول پھول اُس کے رنگ و بُو کے چراغ

ڈال ڈال اس کے چاند کی کرنیں

موج موج اُس کی یاد کے دیپک — اک چراغاں ہے اُس سے گنگ و جمن

ہر طرف اُس کی یاد کی خوشبو
ہر طرف اُس کی بوئے پیراہن

تھا تفکّر یہ ذہنِ نہرو کا — کہ ترقی ہے امرِ لا محدود
ارتقا کا عمل مسلسل ہے — ذہنِ انساں نہیں ہے رہنِ جمود
علم، وجدان، کشف ہے تحقیق — فکر، الہام، جستجو الغرض
مرحبا آج ذہنِ انساں کی — گرہیں کھُل رہی ہیں صبح و مسا

مرحبا آج علمِ ارضی کی — پڑ رہی ہے کمند انجم پر
مرحبا آج دستِ انساں سے — در ستاروں کے ہونے والے ہیں وا
جس پہ ہر راہِ زندگی تھی بند — ہے ستاروں میں راستا اُس کا
واں تخیّل بھی باریاب نہ تھا — ہے جہاں آج نقشِ پا اُس کا
جسے فرشِ زمیں نصیب نہ تھا — بسترِ عیش ہے خلا اُس کا
پہلے دن سے مسافرانِ حیات — بڑھتے آئے ہیں بڑھتے جائیں گے
ہر نفس زینۂ ترقی پر — چڑھتے آئے ہیں چڑھتے جائیں گے
خوبصورت حیاتِ ارفع کا — متحرک شعور تھا نہرو
مرگ آسا خموشِ دنیا کو — اک پیامِ نشور تھا نہرو
تیرہ و تار رہگذاروں میں — ایک فانوسِ نور تھا نہرو
میکدہ وقت عصر تھا ساقی — زیست صہبا سرور تھا نہرو

بے قراری ہی جس کی عظمت ہے
وہ دلِ ناصبور تھا نہرو

وہ ہجومِ بدی میں اک نیکی — بارِ صد عاقبت اُٹھائے ہوئے
وہ ہجومِ گنہ میں اک تقوےٰ — دوسروں کے گنہ اُٹھائے ہوئے

آتے جاتے رہیں گے شام و سحر
دل پہ چھاتے رہیں گے شام و سحر

اُس کی یادوں کے کارواں پیہم
اور زمان و مکاں کی وسعت میں

یہ رہیں گے رواں دواں پیہم
اور رلاتے رہیں گے شام و سحر

ہر مصیبت میں عافیت کی نوید
ہر اندھیرے میں نور کا پیغام

ہر شبِ تار کے لئے مہتاب
ابر آلود ہر سحر کے لئے

مسکراتا ہوا نیا خورشید

کرنوں کے تھال میں سجائے ہوئے
زندگی کے حسین مکھڑے سے

تیرگی کا نقاب اُٹھائے ہوئے
پرچمِ انقلاب اُٹھائے ہوئے

صبحِ نوروز کے جلو میں لئے
ایک تازہ نظامِ لیل و نہار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

پھر یہ جولانگہِ بقا و فنا نئے جلووں سے جگمگائے گی
زندگی پھر نئے جمال کے ساتھ ذرّے ذرّے سے مُسکرائے گی
سر جھکا کر ادب کے ساتھ اُسے وقت پھر تحفۂ بقا دے گا

اک نئی نذرِ ارتقا دے گا
نیا الہام اک نیا القا
اک نیا حُسن اِک نیا جلوا

سب سے پہلی لطیف و شوخ کرن کہر کو نور کی رِدا دے گی
نئے خورشید کی ضیا دے گی

کر کے بیدار خوابِ ماضی سے   نئے خوابوں کا آسرا دیگی
نئے انسان کو صدا دیگی   لاکھ طوفان راستہ روکیں
نئے نہرو کو راستہ دیگی

نئے امکان آنکھ کھولیں گے   نئے اسرار مُنہ سے بولیں گے
اِس زمان و مکاں کے گُنبد میں   بند ہے ایک کائناتِ صدا
نغموں کا اک جہان غلطاں ہے

پھر سکوتِ فنا سے پھُوٹے گی   زندگی کی حسین موسیقی
پھر عیاں موت کے ترنّم سے   نئے سنگیت کا فسُوں ہوگا
خاکِ ساغر کے لمسِ میگوُں سے   ذرّے پھر رشکِ خمُستاں ہونگے
موجِ پایابِ سطحِ دریا سے   پھُوٹ نکلے گا چشمۂ شیریں
بادِ صرصر کے گرم جھونکوں میں   رقص کرنے لگے گی بادِ صبا
دورِ پیمانہ و سبُو ہوگا   ایک طوفانِ رنگ و بُو ہوگا
پھُول موجِ نسیم اُچھالے گی

بارورِ نخلِ آرزوُ ہوگا   ساغرِ گُل جہانِ بُو ہوگا
تازہ کرنوں کا اک جلُوسِ حسیں   ماہ کے کارواں کو لائے گا

اور ابرِ سیہ کا سُرمئی دام
پھونک ڈالیں گی چاند کی کرنیں

مدفنِ شب سے مسکرائے گی صبح
خاکِ انجُم سے اک نیا خورشید

پھر شعاعوں کی رقص گاہوں میں
جشنِ رقاصہ سحر ہو گا

پھر تکلّم سے اُس کے اُبلے گا
اک وقار و جلال کا چشمہ

پھر تبسّم سے اُس کے پھُوٹے گا
اک شعاعِ جمال کا چشمہ

ہیں جو احساسِ حُسن سے محروم
اُن کی محرُومیٔ جمال کو پھر

وہ شعورِ جمال بخشے گا
پستیوں کو کمال بخشے گا

اُس کے پرتو سے رُوحِ شبنم کو
پھر ملے گی صلابتِ آہن

اُس کے سائے سے سینۂ فولاد
پھر کٹوری بنے گا شبنم کی

دُھوپ جب جب ذرا کڑی ہو گی
اُس کا سایہ حسیں گھٹا بن کر

پھر زمان و مکاں پہ چھائے گا

کہنگی جب بھی سر اُٹھائے گی
نہرُو اُبھرے گا تازگی بن کر

جب قدامت پرستیوں کا جنوں
جِدّتوں کا شباب لُوٹے گا

نہرُو بن جائے گا سپر اُن کی

خود پرستی کی جب بھی ہوگی نمود — اُس کی انسان دوستی بڑھ کر

خود پرستی کا سر جُھکا دیگی

جب بھی رجعت اُٹھائے گی فتنے — اُس کی روشن خیالیاں اُٹھ کر

خاک میں فتنوں کو ملا دینگی

جب بھی حملہ کرے گی تاریکی — موجۂ نور بن کے اُبھرے گا

پھر اندھیروں کا چاک ہوگا جگر — پھر اُسے روشنی عطا ہوگی

پھر وہ چمکے گا بن کے ماہِ تمام — پھر اُسے چاندنی عطا ہوگی

ذرّے ذرّے میں حل ہوا ہے وہ — قطرے قطرے میں گھُل گیا ہے وہ

قوّتِ نشو بن گیا ہے وہ

زندگی کے تمام عناصر میں — جذب و پیوست ہوگیا ہے وہ

اُس کی خاکسترِ منوّر سے — جانے کتنے ستارے پھوٹیں گے

جانے کتنے سویرے پھُوٹیں گے

کتنے سُورج اُبھر کے چمکیں گے — کِتنے پھُولوں کے کُندنی پیکر

موسمِ گُل میں جگمگائیں گے

اُس کی خاکِ بہارِ فطرت سے — جانے کِتنے گلاب مہکیں گے

جانے کتنے شباب دمکیں گے

جب بھی گھیرے گی کم نگاہی ہمیں
باز یافت اُس کی دُور بینی کی

ذہن کو جامِ جم بنا دے گی

وسعتِ بے پناہ بخشے گی

خُفتہ احساس کو جگا دے گی

جب بھی کشتی بھنور میں آئے گی
نہرُو آئے گا ناخُدا بن کر

جب بھی افلاسِ رہبری ہوگا
نہرُو اُبھرے گا رہنُما بن کر

روشنی دینگے اُس کے نقشِ قدم
مشعلِ راہِ کارواں بن کر

کبھی خورشیدِ ضوفشاں بن کر

اُس کے قدموں کی چاپ گونجیگی
ہر قدم نغمۂ درا بن کر

عینِ طُوفاں میں جب ڈبوئیں گی
ہم کو قسمت پرستیاں اپنی

تو ہماری ہی خود شناسی میں
نئی تقدیر بن کے اُبھرے گا

نئی تعمیر بن کے اُبھرے گا

علم کو جب زمیں سے کھودیں گے
نئے ادراک کے توسّط سے

اک نیا علم بن کے اُبھرے گا

دینِ نہرو کا آدمیّت تھا　　نوعِ انساں سے اک خلوصِ تمام

جب بھی اِس دین میں پڑے رخنے　　جب بھی گم راہیوں نے بھٹکایا

نہرو اُبھرے گا اوجِ منزل پر

ایک مینارۂ ضیا بنکر

ارتقاء کا علَم اُٹھائے ہوئے　　ہات میں جامِ جَم اُٹھائے ہوئے

شمعِ روشن خیالیوں کی لیئے　　مشعلیں خوش جمالیوں کی لیئے

بہرِ اقوام اِک نیا رشتہ　　اک نیا رابطہ لے کے آئیگا

اپنی نکہت فروز سانسوں سے　　تیغ و خنجر تفنگ و ایٹم میں

امن کا گلستاں کھلاتا ہوا

آشتی کا جہاں بساتا ہوا

اپنے عکاسِ غم تبسّم میں　　آنسوؤں کی نمی چھپاتا ہوا

ہات میں اک کنول کا پھول لیئے

سینے پر اک گلاب کا غنچہ

اور اپنی جمیل آنکھوں میں

سو نئی زندگی کے خواب لیئے

اور اپنے دلِ تپیدہ میں اک نیا سوزِ انقلاب لیئے

امن ہی امن اور پیار ہی پیار

سرِّ مرگ و حیات کیا کہیئے موت خوابیدہ ، زندگی بیدار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیئے

موت اسرار، زندگی اسرار

وہ سراپائے عشق تھا اور عشق — مشعلِ جاودانِ ہستی ہے
وہ سراپائے حسن تھا اور حسن — شعلۂ شمعِ جاودانی ہے
جس سے ہے کائناتِ جاں روشن — یہ مکاں اور لامکاں روشن
موت بے دست و پا کنیزک ہے — حسن کی بارگاہِ انور کی
یہ کنیزِ سیاہ روائے دوست — حسن کی شمعِ جاودانی کو

مشعلِ جاودانِ ہستی کو
لاکھ چاہے بجھا نہیں سکتی

وہ سراپائے حق تھا حق کا چراغ — موت کے تند و تیز جھونکوں سے

نہ بجھا ہے نہ بجھ سکے گا کبھی

وہ سراپا اُمید تھا لوگو! اور اُمید ہے تسلسُلِ زیست
یہ تسلسُل کبھی نہیں ٹوٹا
اور نہ ٹوٹیگا یہ تسلسُلِ زیست

مثلِ خُورشید ہوگیا ہے غروب لیکن آغوشِ صبحِ فردا سے
مثلِ خُورشید پھر عیاں ہوگا

ماہ کی طرح چھُپ گیا ہے وہ لیکن ایوانِ شب کے پردوں سے
ماہ کی طرح پھر عیاں ہوگا

نہ ہو مُرجھا گیا ہے مثلِ گلاب لیکن اک روز خاکِ گلشن سے
پھر وہ مثلِ گلاب پھُوٹے گا

زندگی کیا ہے اور موت ہے کیا کیا ہیں اسرارِ صبح و شام نہ پوُچھ
ہیں رموزِ حیات بے پایاں بزمِ تخلیق کا نظام نہ پُوچھ
شمع سے شمع جلتی آئی ہے
پھُول سے پھُول کھِلتے آئے ہیں

گُلِ افسُردہ شاخ سے گِر کر خاکِ گلشن کو تخُم دیتا ہے
سینکڑوں نو شگفتہ پھُولوں کے

ہے خزاں فصلِ گُل کا عارضی روپ
فصلِ گُل جاوداں حقیقت ہے

دمبدم اک نئی بہار کا رُوپ
اِسی تنظیم کی بدولت ہے

کل طلوعِ بہار پھر ہو گا
جس جگہ آج شورِ ماتم ہے

اُس جگہ نغمہ زار پھر ہو گا

ایک کیا سینکڑوں گلابوں میں
اُس کی خوشبو، جمال، اُس کے رنگ

اُس کے رنگوں کے خوشنما سائے
ہر طرف اک چمن کھلا دیں گے

چار سُو نکہتیں لُٹا دیں گے

مہک اُٹھّے گا خود مشامِ بہار

حکمتِ مرگ و زیست کیا کہیے

موت اسرار، زندگی اسرار

آج بھی وقت کے دریچوں سے
نفَسِ صبح و شامِ طوفاں سے

ایک آواز آ رہی ہے مجھے!
شورِ طوفان کو دباتی ہوئی
شعلۂ بے اماں بجھاتی ہوئی
اور بپھری ہوئی جوانی کو
ضبط کا راستہ دکھاتی ہوئی
ایک آواز آ رہی ہے مجھے
ساری تاریخ اک گواہی ہے
کہ ہے نفرت ہی حاصلِ نفرت
اور انجام ہر تشدّد کا
ایک نا مختتم تشدّد ہے
کہیں شعلوں سے پُر انگیٹھی میں
پودا جوہی کا اُگ سکا ہے کبھی

پھُول چمپا کا کھِل سکا ہے کبھی

اپنا گھر پھُونک کر کسی نے کبھی   اپنے گھر کو چمن بنایا ہے؟

حجلۂ یاسمن بنایا ہے؟

جس کا گھر غیظ میں جلایا گیا   اُس کے مظلوم دل پہ دُنیا میں

کِسی فاتح نے فتح پائی ہے؟

ظلم مظلوم پر نہیں ہے ظلم   ظلم حملہ ہے اپنی ذات پہ بھی

ظلم ہے وار اپنی دھرتی پر

تیرے خنجر کی ضربِ کاری سے   خون کی ایک موجِ بے پایاں

دلِ مظلُوم سے نہیں جاری

بہ رہا ہے ترے جنوں کی قسم

قلبِ انسانیت سے دجلۂ خوں

جہاں ہنسا کا راج ہوتا ہے   نغمہ وساز کے بجائے وہاں

سازِ زنجیر و طوق چھڑتا ہے   رسن و دار لائے جاتے ہیں

راگ پھر چھیڑتی ہے ویرانی

ڈھول پھر پیٹتے ہیں سنّاٹے

پھر غلامی کا رقص ہوتا ہے

ظلم کو کوئی سہہ نہیں سکتا

ایسے بے حس نہیں ہیں اس دیگ میں   سمجھیں خنجر کو جو گلاب کی شاخ

اور تلوار کو کنول سمجھیں!

ظلم کے سامنے جُھکا دیں سر

اپنے دل میں اُتار لیں خنجر

موجۂ خوں کو سیلِ آب کہیں   موت کو اپنی زندگی سمجھیں

تیرگی کو جو روشنی سمجھیں

نہیں اس عہد کا ضمیر نہیں

کہ جو چاہے اُسے مسل ڈالے   اُٹھّے اور پاؤں سے کُچل ڈالے

شعلۂ نفرت و تشدّد سے   صرف افراد ہی نہیں جلتے

زیست کی آبرو بھی جلتی ہے   دولتِ رنگ و بُو بھی جلتی ہے

باغ جلتے ہیں کھیت جلتے ہیں

اپنی فصلِ بہار جلتی ہے

جنّتِ شاخسار جلتی ہے

قصرِ تہذیب خاک ہوتا ہے   کاخِ تادیب خاک ہوتا ہے

سُلگ اٹھتا ہے زندگی کا نظام

امن سے انحراف تو ہے گُناہ   وہی لوگ اپنے زعمِ طاقت میں

امن سے انحراف کرتے ہیں

جن سے پنہاں ہے زندگی کا جمال

اور جو اعمالِ زشت کی خاطر   زندہ ہیں تیغ کے سہارے پر!

لیکن اس جاگتے زمانے میں

ظلم کو کوئی سہہ نہیں سکتا

آج بھی عصر کے جھروکوں سے
جو سجے ہیں بجائے پھُولوں کے　　جنگ کے امن سوز شعلوں سے
آہ سی اک سُنائی دیتی ہے

جنگ دشمن ہے لالہ زاروں کی　　نو دمیدہ شگفتہ پھُولوں کی
تاک کے بادہ بار باغوں کی　　دھان کے زرنگار کھیتوں کی
کارگاہوں کی کامگاروں کی　　زندگی کی حسیں بہاروں کی
جھانکتے ہیں جو سبز شاخوں سے　　اُن حسیں نوشگفتہ غنچوں کی

اور سنہری زمیں کے پردے سے مسکراتے ہوئے نہالوں کی
گود میں مسکراتے بچوں کی ساز میں سانس لیتے نغموں کی
حسن کی عشق کی محبت کی عیش کی شوق کی مسرت کی
نغمہ و شعر و علم و حکمت کی فکر و فن صنعت و صناعت کی
حسن ترصیع کی تزئین کی روح تہذیب کی تمدن کی
نسل نو کے لطیف جذبوں کی آدمی کے عظیم ارادوں کی
ارتقائے حیات کی بیری جنگ ہے کائنات کی بیری

خون انساں شراب ہے اس کی
نقش ہیں اس کا ملک و شہر و دیار

اب بھی نہرو کی آہِ نیم شبی
پیکرِ قلب و جاں میں گونجتی ہے گونجتی ہے جہاں کی وسعت میں
نیل کے ساحلوں پہ گونجتی ہے والگا کے حسیں کناروں پر

ڈان کی پُرسکون لہروں پر
مسی سپی کے ساحلوں پہ کبھی کبھی راوی کے تٹ پہ گونجتی ہے
کبھی گنگا کے تٹ پہ گونجتی ہے

کبھی جمنا کے تٹ پہ گونجتی ہے

اور کبھی ٹیمز کے کناروں پر گونجتی ہے پیامِ جاں بن کر

وصلِ امواج کی تمنّا میں

جنگ کے مورچے چمن بن جائیں خندقیں یوں پٹیں گگن بن جائیں

کاش آتش فشاں جہازوں کو کوئی اپنی نوا کے جادو سے

ہنس کی نغمگی عطا کر دے

کاش شعلوں کو کوئی پہنا دے

یاسمن کی لطیف و نرم قبا

دُود و آتش کے سیلِ بیحد کو

بخش دے خنکیٔ نسیم و صبا

خنجروں کو گلاب کی فطرت

پتّھروں کو مزاجِ جامِ بلور

نرم و نازک حسین لفظوں سے کہیں ایٹم کا دل پگھلتا ہے

نرم و شیریں بلیغ جملوں سے کہیں مٹتا ہے زہر گیسوں کا

دل کشا اور لطیف نغموں سے
کہیں سنگین پھول بنتی ہے
پھول جیسے لطیف لہجوں سے
نوکِ خنجر کنول بنی ہے کبھی
ذکرِ نیکی فقط نہیں نیکی
صرف دعوائے امن، امن نہیں
نہ طلاقت میں امن پوشیدہ
نہ خطابت ہے امن کی کنجی
نہ فصاحت میں امن پوشیدہ

حرمتِ جاں زندگی کی قدریں ہیں
اِن سے نقشِ حیات اُبھرتا ہے
اِن سے رنگوں میں جان پڑتی ہے
چہرۂ رنگ و بُو نکھرتا ہے
اِن سے پیشانیٔ حیات پہ نور
اِن سے ہے روئے زندگی پہ نکھار
روئے تہذیب کی یہ تابانی
نور اِن سے رُخِ تمدّن پر
اِن سے کردارِ آدمی کا وقار
ہیں یہ قصرِ صفات کی معمار
اِن سے بجھتی ہے پیاس انساں کی
اِن سے احساسِ زیست ہوتا ہے
اِن کی خاکسترِ تپیدہ پر
امن عالم کی ہے اگر بنیاد
تو ہے وہ امن جنگ سے بدتر
اک نیا فتنہ ہے وہ امن نہیں

نیا اندیشہ ہے وہ امن نہیں

عہدِ تخریب میں پلا ہے جو امن وہ بھی انسان کو گراتا ہے
پستئ بے کراں کے غاروں میں

امن کے پُر سکون دور میں بھی اک نئے رنگ سے اُبھرتا ہے
عاشقانِ فساد کا کردار

جارحیّت ہے جنگ کی بنیاد نئی دنیا کی برملا توہین
ارتقائے مقدس ایواں میں رجعتِ بے حیا کی گستاخی
علم و دانش کی بارگاہوں میں بے محابا درندگی کا رقص
بے تحاشا درندگی کا رقص

خوبصورت زمیں کے سینے پر دندناتی قیامتِ کبریٰ
دستِ تہذیب و آدمیّت سے خون تہذیب و آدمیّت کا
شمعِ جاں جا بجا بجھاتی ہیں جارحیّت کی آندھیاں جب تک
امن کا دیپ جل نہیں سکتا

جارحیّت کی رُوحِ خونیں سے کرتی ہے جب مقابلہ نیکی

ہات جب دوستی کے بڑھتے ہیں صلح جب ہم کسی سے کرتے ہیں
ایسی نازک گھڑی میں بھی ہم کو امن کی لاج رکھنی پڑتی ہے
کہ کہیں لغزشِ تکلّم سے تُند و برہم مزاجِ امن نہ ہو

امن اک وصف ہے نہیں ہے گماں
اک صداقت ہے مسکراتی ہوئی

ہے یہ جُوئے رواں سراب نہیں اک حقیقت ہے امن خواب نہیں
امن کی نکہتوں میں کھلتے ہیں شام کے پھُول، صبح کی کلیاں
امن کی نزہتوں میں پلتا ہے کونپلوں کا تصوّرِ نازک

ابتسامِ لطیف پودوں کا
امن کے پالنے میں جاگے گی کنمنائے گی مُسکرائے گی

ہے جو دُنیا عدم میں خوابیدہ
زیست کے پیچ و خم میں خوابیدہ

یہ ہُمکتے ہوئے حسیں بچّے یہ چہکتے ہوئے حسیں طائر
نرم نرم اِن کے دست و بازو ہیں اِن کے معصُوم چشم و ابرُو ہیں

اِن کے سینوں کی نرم دھڑکن میں   زندگی کی تمام موسیقی
اِن کے مکھڑوں کے صاف درپن میں   زندگی کا لطیف تر جوہر

دولتِ شائیگاں ہیں یہ کل کی
اک متاعِ گراں ہیں یہ کل کی

کسے معلوم اِن کی ہستی میں   کتنے امکان سانس لیتے ہیں
اِن کے غنچہ صفات جسموں میں   کیسے انسان سانس لیتے ہیں
شاید اِن شوخ نونہالوں میں   شاید اِن مسکراتے لعلوں میں

شاید اِن گل رخوں کے جھرمٹ میں

کوئی اکبرؔ ہو اور کوئی اشوکؔ   کوئی ٹیگورؔ اور کوئی داراؔ
کوئی چشتیؔ ہو اور کوئی نانکؔ   کوئی گوتمؔ ہو اور کوئی گاندھیؔ
کوئی حافظؔ ہو یا کوئی فیضیؔ   کوئی ہومرؔ ہو کوئی فردوسیؔ
کوئی سقراطؔ کوئی افلاطونؔ   کوئی لینِنؔ ہو یا کوئی لنکنؔ

اور بہ فیضانِ ارتقائے حیات
وہ بھی اک شخص ان میں پنہاں ہو
کہ جو فردا کا رہنما ہوگا

نئے طوفاں سے پنجہ کش ہوکر
اپنی کشتی کا ناخدا ہوگا

امن تخلیقِ نَو بہ نَو کا امیں | جلوۂ نَو بہ نَو کا یہ مشرق
امن معمار کی نگاہ کا نور | مہرِ تعمیر کی حسین کرن
مخزنِ نوا چھوتے سازوں کا | اک رسدگاہ تازہ نغموں کی
نئے ایوانِ رقص کی محراب | سنگِ میل اک نئے ترنّم کا

آئینہ خانۂ جمالِ حیات

جس کی ہر رات اک شبِ مہتاب | جس کا ہر دن طلوعِ صبحِ بہار
فرش ہیروں کا چھت زمرّد کی | اور ستاروں ٹکے در و دیوار

شانہ کرتی ہیں جس میں تہذیبیں
اور تمدّن سنوارتا ہے جہاں
نئے خوابوں کے کاکل و رخسار

حکمتِ امن اپنا ورثہ ہے | ہے یہ ورثہ چراغِ راہِ نجات
قرن ہا قرن پہلے مشرق نے | یہ چراغِ ہدیٰ جلایا تھا

آج بھی یہ چراغ روشن ہے

معبدِ رُوح میں ہے اس کی ضیا کعبۂ دل میں چاندنی اِس کی

ہے لہُو بن کے جاری و ساری جسمِ مشرق میں روشنی اِس کی

تُند خو آندھیاں ہزار چلیں لاکھ مشرق سے زلزلے جو جیں

کہیں یہ شمعِ نور بجھتی ہے

اک جگہ گر اِسے بُجھائیں گے سو جگہ اِس کا نُور پائیں گے

ابدی ہے یہ آشتی کا چراغ

شانتی وں کی خاک سے ہمدم!
اب بھی اُٹھتی ہے ہُوک سی اکثر
ماتم اے ارتقائے انسانی!

دل تہی، جاں تہی، نگاہ تہی بے کسی، بے بسی و بے بصری
چار سُو اک غُبارِ بے مہری ہر طرف اک محیط تاریکی

رُوحِ انساں کو کیا ہوا آخر
راکھ میں جیسے سَرد چنگاری
ماتم اے ارتقائے انسانی!

کہ علاقوں کے قُربِ کے باوصف ۔۔۔ اس قدر بُعد، اس قدر دُوری
دلِ انساں میں اس قدر تلخی !

تُرش اور تُند و تیز یہ لہجے ۔۔۔ جیسے خنجر چھُپے ہوں ہونٹوں میں
تلخ اور دل خراش یہ جُملے ۔۔۔ زہر جیسے گھُلا ہو لفظوں میں
ماتم اے ارتقائے انسانی !

شرق کی حکمتوں پہ کیا بیتی ۔۔۔ غرب کے فلسفوں پہ کیا گذری
کیا نظامِ مسیح پر بیتی ۔۔۔ اُسوۂ مصطفےٰ پہ کیا گذری
آتما کیا ہوئی پُرانوں کی ۔۔۔ رُوح ویدوں کی کیا ہوئی لوگو
درسِ گوتم کا کیا مآل ہوا ۔۔۔ کیا کوئی حرف بھی نہیں باقی
حکمتِ لازوالِ گیتا کا؟

نئی فکرِ رسا پہ کیا بیتی ۔۔۔ دانشِ حاضرہ پہ کیا گذری
ذہنِ انساں ہے شعلہ زار ایسے ۔۔۔ کھیت جیسے شہابِ ثاقب کا
اندر اندر بھبک رہا ہے جنُوں
جیسے لَو دے اُٹھےگی اب دُنیا
ہاں یقیں ہے مجھے یقیں ہے مجھے ۔۔۔ کہ نہیں امنِ عالمی ممکن

۱۶۱

آدمیّت کے فیض سے جب تک
آدمی، آدمی نہیں بنتا
جب تک اک انضباطِ اُنس و وفا
مذہبِ آدمی نہیں بنتا
جب تک اقدارِ زندگی کو ندیم
زندگی سے فرار کا عادی
عظمت و برتری نہیں دیتا

شورشِ بے کنارِ طوفاں میں!
اُس کا ایقان دے رہا ہے صدا
اُس کی اُمّید مُسکراتی ہے
وقت نے کتنے رُوپ بدلے ہیں
دیکھتے دیکھتے ہمارا جہاں
دُوری بدلی ہے ذوقِ قربت سے
بے بسی اختیار سے بدلی
پہنا نفرت نے خلعتِ اُلفت

کتنے بدلے ہیں زندگی نے لباس
کتنا بدلا ہے، کتنا سمٹا ہے
کہنگی تازگی، جدّت سے
بے قراری قرار سے بدلی!
زعمِ دیں ہے نہ کبرِ قومیّت

دل نہیں ہے غلام جذبے کا　　　جذبہ منطق کی شان رکھتا ہے
عقل کی آن بان رکھتا ہے

جس طرف بھی نگاہ جاتی ہے　　　ایک طوفان ہے تغیّر کا
قربِ عالم کی اک نئی حسرت　　　ایک شوخی، اُمنگ، شادابی
اسی تغیّر کی بدولت ہے

اک لگن عالمی تعلق کی　　　انہیں بے تابیوں کی مظہر ہے
نئی مخلوق کی تلاش مُدام　　　یہ تجسّس نئے جہانوں کا
یہ کمندیں، یہ پے بہ پے جستیں　　　جذبۂ شوق کی ستاروں پر
اک نئی جوششِ تمنّا ہے
ماورا سے قریب ہونے کی

اپنا یہ عہد، یہ مُسافرِ ماہ　　　ماضیٔ خود پرست سے بڑھ کر
مئے انسانیت کا تشنا ہے
قُربت و ہمدمی کا بھوکا ہے

مجھے اُمید ہے یقیں ہے مجھے　　　شمعِ صبر و رضا کے پروانے
امن اور آشتی کے دیوانے

پنجہ کش ہیں جو آندھیوں سے ابھی   پنجہ کش ہیں جو موجِ طوفاں سے

پنجہ کش ہیں جو زلزلوں سے ابھی

اب بھی کہسار کاٹ سکتے ہیں

امن کی جوئے شیر کی خاطر

شورشِ بے کنارِ طوفاں میں   اُس کا ایقان دے رہا ہے صدا

اُس کی اُمید مسکراتی ہے

صبح کے پُر سکوں دھندلکے میں
میں نے پھر اک صدا سُنی ہے ندیم   آتے آتے مری سماعت تک
وہ صدا نغمہ بن گئی ہے ندیم

زندہ باد اے مرے عظیم وطن
رہیں شاداب تیرے کوہ و دمن
یونہی نغمہ کُناں رہیں پیہم
یہ تری نربداؔ و گنگؔ و جمنؔ
خوشبو پھیلے تری بہار بہار
پھول مہکیں ترے چمن بہ چمن
زندہ باد اے مرے عظیم وطن

فکر و احساس کا نشان ہے تُو　　گیان اور دھیان کا جہان ہے تُو

عِلم و حکمت کا آسمان ہے تُو

جذب ہے تیری خاک میں درشن

زندہ باد اے مرے عظیم وطن

گیانی ہے اور ماورائی ہے تُو　　رمز و اسرار کی خدائی ہے تُو

اور یہ تیرے سادہ دل بندے　　گم ہیں جو اپنی ذات میں تنہا

ساری دنیا سے توڑ کر رشتہ

گم ہیں جو عاقبت کے خوابوں میں　　فکر و تخیل کے سرابوں میں

کاش احساسِ زندگی ہو انہیں

توڑ دیں فِکر کا نظامِ کہن

زندہ باد اے مرے عظیم وطن

دُور سے جن کی آ رہی ہے صدا　　فاصلے بحر و بَر کے طے کر کے

نغمہ خواں ہیں جو تیری رفعت کے　　تیری رُوحانیت کی عظمت کے

راز شاید یہ اس میں ہے مُضمر　　کہ تُو ڈوبا رہے تخیّل میں

اور سمندر ترے تخیّل کا　　حشر کے روز تک بھی خشک نہ ہو

اِن کے میلے لگیں کنارِ چمن

زندہ باد اے مرے عظیم وطن

تیرے گُن گا رہے ہیں جو گیانی — یہ مفسّر ترے یہ "عرفانی"

چاہتے ہیں کہ تیری دھرتی پر — اصل میں اُن کی حکمرانی ہو

فکر کی اُلجھنوں کے پھندوں سے — تیرے ماحول کو رہائی نہ ہو

موت سے تو قریب ہو جائے — زیست سے تیری ہم نوائی نہ ہو

اور تُو گم رہے تخیّل میں — اور سمندر ترے تخیّل کا

حشر کے روز تک بھی خشک نہ ہو

اور یہ تیرے رشی، مُنی، گیانی — کیف میں حکمتوں کے چوُر رہیں

چُپ رہیں اور کسی سے کچھ نہ کہیں

تجھ پہ چھایا رہے خمارِ کہن

ہوشیار اے مرے عظیم وطن

خوشبو پھیلے تری بہار بہار

پھُول مہکیں ترے چمن بہ چمن

زندہ باد اے مرے عظیم وطن!

خاک ہو کر بھی اُس کو چین نہیں

اُس کی بے تابیاں زباں بن کر
بولتی ہیں مرے تصوّر میں

حال و ماضی کی قصّہ خواں بن کر

صبحِ فردا کی ترجماں بن کر

گھیرے رہتا ہے حال کو ماضی
گردشِ ماہ و سال کو ماضی

بے نہایت ہے یہ بسیط ہے یہ
فکر و وجدان کو محیط ہے یہ

ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
جیسے اک بار ہے مرے سر پر

بارِ تاریخ کے فسانوں کا

قرنوں کا صدیوں کا زمانوں کا

پُوری تاریخ کے حقائق کا

بارِ ماضی کی بخششیں مت پُوچھ   یہ حرارت بھی بخشتا ہے کبھی

زندگی کی حرارتِ تازہ

آرزُو کی لطیف چنگاری

شوقِ تعمیر کا حسین خیال   ذوقِ تخلیق کا جمال و جلال

نئے خوابوں کا اک بسیط جہاں

ہر نفس سینکڑوں زمان و مکاں

جاری ہوتی ہے جوئے فیض اِس کی   صرف اُس وقت میرے وجداں میں

جب یہ چھُوتا ہے حال کا دامن

اور پھر سیلِ مُضطرب کی طرح   حال کے دل میں ڈوب جاتا ہے

یہ نہ ہو گر تو سرد ہے ماضی   ایک پتھّر، چٹّان، ایک کھنڈر

ایک بنجر زمین، اک اُوسر   مُردہ رُو، دُھند کا کفن اوڑھے

موت ہی موت، زندگی سے تہی

پھر بھی یہ لابُدی حقیقت ہے

کہ حسیں سے حسین تر کوئی شے　　اپنی میراث سے حسین نہیں
دورِ ماضی کی یادگارِ عظیم　　فکرِ ماضی کا شاہکارِ عظیم
جہد و علم و فنون کا حاصل　　بے نہایت ریاضتوں کا نچوڑ
ورثہ ہر چند ہے عظیم مگر　　درِ نئی عظمتوں کے بند نہیں
عہدِ ماضی کی حکمتیں برحق　　درِ نئی حکمتوں کے بند نہیں
صرف ورثے پہ اکتفا کرنا　　موت ہے ذہن کی فطانت کی

آج کی حکمتوں سے محرومی

قوم اِس عہدِ نو میں کرتی ہے　　اپنے اجداد کی جو نقّالی

وہ ترقی کا زرنگار آنچل
ٹکتفیٔ اُنگلیوں کے پوروں سے
اِس زمانے میں چھو نہیں سکتی

کیا طلسمِ جمالِ ماضی ہے　　مٹ گیا اور حسین ہے ماضی
ہو چکا اس کا حسن خاک مگر　　آج تک مہ جبین ہے ماضی
نیست و نابود ہو کے دنیا سے　　روح و دل میں ہے جاگزیں ماضی
اِس کی رمزِ جمال کیا کہیئے　　اِس کے نقش ہزار پرتو پر

ہے ہزاروں تصوّرات کی تہہ   خوابوں کی اور تخیّلات کی تہہ
تہہ روایات اور فسانوں کی   گرد آلود داستانوں کی

مہ جبین و حسین یہ ماضی
خاک بھی جس کی اب نہیں باقی
ہے ہمارے ہی ذہن کی مخلوق
ہے ہمارے ہی بُتکدے کا صنم

"حال" اک زندہ تر حقیقت ہے   اُس سے زندہ ترین "مستقبل"
ایک تعبیر گاہ خوابوں کی   ایک تحویل انقلابوں کی
نئی اقدار کا امانت دار   نئے اطوار کا امانت دار
اک نئے کفر کا شباب کدہ   نئے ایمان کا ثواب کدہ
اِک نئے حُسن کا بہار کدہ   اک نئے عشق کا نگار کدہ
جلوہ گہ بے قرار جلووں کا   شبستاں اک جواں تمنّا کا
نئے ذوقِ گناہ کا مامن   نئے شر، تازہ خیر کا مسکن

نئے یزداں کا وہ حریم جلال
تازہ دم اہرمن کا مسکنِ فکر

نیا کعبہ، نیا صنم خانہ
نئے آذر کا دیرِ بُت سازی
اک نئی ضربتِ براہیمی
اک نئی کارگاہِ بُت شکنی

رشتہ جو جوڑتا ہے ماضی سے　　حال سے وہ فرار کرتا ہے
حال سے جو فرار کرتا ہے　　رحم کرتا نہیں ہے حال اُس پر
غور کرتا نہیں ہے مُستقبِل
وقت پہچانتا نہیں اُس کو
دہر گردانتا نہیں اُس کو
ہے وہ محرُومِ دولتِ فردا
دمبدم کہہ رہی ہے یہ تاریخ　　کہ کسی شے کو یاں ثبات نہیں
دین و تہذیب اور تمدّن کو　　گردشِ وقت اپنے ہاتھوں سے
دفن کر دیتی ہے زمیں کے تلے
اور پھر حال کے تقاضوں سے　　نئی تہذیب ڈھالی جاتی ہے

اک تمدّن نیا اُبھرتا ہے
کھو دی جاتی نہیں ہیں تہذیبیں

ہے وہ تخلیق کا جُنوں تازہ   بخشتا ہے جو مِلّتوں کو دوام
اک نئی زندگی کا ذوقِ تلاش
خُون میں آرزُو کی جولانی
ہر نفَس عشق جلوۂ نَو کا

تیرہ و تارِ شب کے سینے سے
اب بھی آتی ہے اک صدا ایسی گیت جیسے کسی مسافر کا
گونج اٹھتا ہے روشنی بن کر
چمک اٹھتا ہے چاندنی بن کر
تنگ و تاریک شاہراہوں پر
مسکرانے کو ہے جو کل کی سحر نئی کرنوں کی آب و تاب کے ساتھ
پرچمِ نورِ آفتاب کے ساتھ
اک نئے بال پن کو ساتھ لئے سینہ تانے ہوئے شباب کے ساتھ

اک جہانِ تجلّیات لیئے　　شوق کی تازہ کائینات کے ساتھ
نئی اُمید کے جلوس کے ساتھ　　نئے ارمانوں کی برات لیئے
تیری جولانیٔ نظر کے لیئے　　تحفۂ حُسنِ شش جہات لیئے
اک جہانِ تغیّرات لیئے

تیری منزل وہ صبحِ روشن ہے　　جس کی کِرنوں میں مُسکراتا ہے
وقت مستقبلِ حیات لیئے

آج کی صبح ہے فقط سایا　　صبحِ فردا کے حُسنِ کامل کا
صبحِ فردا تو ہے چھُپائے ہوئے　　اپنی عالم فروز کرنوں میں
نئے عالم نئے زمان و مکاں

حال پر اکتفائے شوق نہ کر　　منزلِ شوق صبحِ فردا ہے
صُبحِ فردا خزانۂ امکاں

یہ طلسمِ صدا عجب شے ہے
شورِ ہستی محیط ہے مجھ کو
لیکن آواز آئے جاتی ہے
شورِ ہستی پہ چھائے جاتی ہے

آندھیوں کو صبا بناتی ہوئی
زلزلوں کا جگر ہلاتی ہوئی
دار کی داستاں ہے ہونٹوں پر
گیت زنداں کے گنگناتی ہوئی
جذب جن میں مجاہدوں کا لہو
سُرخ وہ پیرہن اُڑاتی ہوئی

وہ زمانِ شباب یاد کرو
خندۂ انقلاب یاد کرو
جس پہ قرباں کائناتِ خرد
وہ جنونِ شباب یاد کرو

اور وہ سرما کی چاندنی راتیں
جیل کے بام و در پہ مستولی

اور وہ چاندنی وہ اُس کا سکوت
مُنحنی دامِ ریشمیں کی طرح

اور وہ زنداں کا گوشہ تاریک
اور سیہ آہنی سلاخوں سے
ایسے آتی تھی اپنے زنداں میں

اور وہ زنجیر پا کا بوسۂ سرد
چاند کی آخری کرن چھن کر
جیسے بھٹکا ہوئی کوئی ساتھی

آئے قیدی کے پاس رات گئے

وہ زمانِ شباب یاد کرو!

موم کا سامنا تھا آہن سے
سنگ سے شیشے کا مقابلہ تھا

تیغ پر شاخِ گُل کا حملہ تھا
شعلے سے برگِ گل کی آویزش

پھول سے اولے کا معاملہ تھا

ظلم کے قہقہے تھے ایک طرف
اک طرف گولیاں سنان و تُفنگ
اک طرف برق بار سنگینیں

اک طرف تھا سکوتِ صبر و رضا
اک طرف سر فروشیوں کی اُمنگ
اک طرف تھے کھلے ہوئے سینے

اک طرف رہ زنانِ آزادی
اک طرف کاروانِ آزادی

اک عجب تجربہ، عجب اقدام — اک نئی جنگ، اک نیا حربا
اک نئی رہگذر، نئی منزل — نیا طوفان، اک نیا ساحل
اک نئی آرزو، نئی حسرت — نیا ارمان، اک نیا جذبا

ثبت ہے ثبت ہے دلوں پہ ابھی
آج بھی اُس کی یاد آتے ہی
دل میں جل اُٹھتے ہیں ہزار چراغ

عشق پھر امتحان چاہتا ہے — پھر نیا بابِ زندگی وا ہے
ایسا محسوس کر رہا ہوں میں — کہ کسی شے کو کھو دیا ہم نے
آ کے ساحل پہ کامیابی کے — اپنا سب کچھ ڈبو دیا ہم نے
ہر کسی کو علیحدگی کا جنوں — ہر طرف ذات پات کا جذبا
ہر طرف ہے تعصّبوں کا خروش — ہر طرف چیختی ہوئی رجعت
فرقہ داری شرارِ نفرت سے — آگ ہر سمت ہے لگائے ہوئے
فتنے ہر سمت ہے اُٹھائے ہوئے
ایکتا کے وسیع خوابوں کی — دھجّیاں ہر طرف اُڑائے ہوئے

جیسے انسان کا وجود نہیں ۔ جیسے ایمان کا وجود نہیں
جیسے دستور اِک تمسخر ہے ۔ جیسے آئین ہے صرف ایک مذاق
جیسے یہ میری آرزو کا چمن ۔ اک بیاباں ہے ایک صحرا ہے
کیا ہوا وہ شرار، وہ شعلہ ۔ کیا ہوئی شوق کی وہ چنگاری
بُجھ گیا کیوں وہ آرزو کا چراغ ۔ جس کے ہلکے سے ایک پرتو نے
روشنی صبح و شام کو دی تھی

خس کو بخشی تھی برق کی فطرت ۔ برق کو سرد خانۂ شبنم
ذرّوں کو استقامتِ کہسار ۔ کوہساروں کو اضطرابِ حیات
برف میں حدّتِ شرر بھر دی ۔ اور شرر میں بہاؤ دریا کا
جن میں آلام کی سمائی نہ تھی ۔ انہیں اک ظرفِ بیکراں بخشا
اور جو مسلوبِ بے کسی تھے انہیں ۔ جذبۂ تازہ و جواں بخشا
جو کبھی ظلم سہہ نہ سکتے تھے ۔ ظلم سہنے کی اُن کو قوّت دی
جنہیں صبر و رضا سے نفرت تھی ۔ اُنہیں صبر و رضا کی دولت دی
کیا ہوا ذوقِ آبلہ پائی ۔ ڈھونڈھ کر لاؤ پاؤں کے چھالے
جن سے ہر موڑ پر چراغاں تھا

اوراب ہر طرف اندھیرا ہے ہر طرف اک جمود، سنّاٹا
جیسے ہو زندگی شبِ دیجور!

کاش ہر شخص کا ضمیر اُسے اِس اندھیرے میں سیدھی راہ دکھائے
فکرِ تازہ کی رہنما کوئی لہر ذہنِ گمراہ و قلبِ ویراں میں
اک نئی رُوحِ آگہی بھر دے
شمعِ احساس کا کوئی پرتو دلِ پژمُردہ و حراساں میں
اک نیا عزمِ زندگی بھر دے
آتشِ شوق کا کوئی شعلہ رُوحِ ویران و سرد و جامد کو
پھر نئی آرزو سے گرما دے

یہ نہ سمجھو کہ دے کے قربانی قیمت آزادی کی ادا کردی
یہ وہ جنسِ عجیب ہے جس کی کبھی قیمت ادا نہیں ہوتی
ابدی ہے خراجِ آزادی

آج بھی اُس کی فِکر کے سائے
جائزہ لے رہے ہیں موسم کا
جیسے بنجر زمیں کی چھاتی سے
کھیت اُگتے ہوئے نہیں دیکھے
جیسے پتھّر کے سخت سینے سے
پھُول کھِلتے ہوئے نہیں دیکھے
تُندخُو آندھیوں کے جھونکوں میں
جیسے جلتا نہیں چراغ کبھی
ریگ زاروں میں نخلِ نرگس کا
جیسے پروان چڑھ نہیں سکتا
جیسے کیسر کا زرفشاں پودا
گرم ماحول کی تمازت میں
ایک پَل بھی پنپ نہیں سکتا

رُوحِ جمہُوریت بھی ایسے ہی
مُفلسی میں پنپ نہیں سکتی

ہے جہاں نابرابری کی وبا بے کسی اور بے لبسی کی وبا

جہاں فاقہ غذائے انساں ہے بے زری دولتِ غریباں ہے

چشمِ مفلس ہے کاسہ لیس جہاں جس جگہ ہر نظر بھکاری ہے

بار بردارِ قحط ہے انساں زیست افلاس کی سواری ہے

گر نمی ہے تو چشمِ دہقاں میں ورنہ ہر سمت خشک سالی ہے

خفتہ ہے علم، سردِ روحِ عمل پاؤں جامد ہیں اور ہات ہیں شل

صرف بنجر نہیں زمیں ہی جہاں دل بھی بنجر ہیں ذہن بھی بنجر

ایسی بے برگ و بار دھرتی میں

نخلِ جمہوریت کا پنپا ہے؟

پھول جمہوریت کا مہکا ہے؟

یہ زمیں مانگتی ہے خونِ جگر

کیا تجھے ذوقِ آبیاری ہے؟

اب بھی اُس کے وجیہہ سایوں میں
ایک انساں کی لَے اُبھرتی ہے
آساں ہے مُنکرِ خدا ہونا نہیں انکارِ آدمی مُمکن !
اور جو انسان سے بھی مُنکر ہوں تو کسی شے میں جان ہی نہ رہے
شمعِ اُمیدِ زیست گُل ہو جائے
ایک ذرّے میں زندگی نہ رہے
ڈوب جائے جہاں اندھیرے میں یہ زمان و مکاں اندھیرے میں
آساں ہے مُنکرِ خدا ہونا
نہیں انکارِ آدمی مُمکن!

زندگی سے اُسے محبّت تھی

اب بھی اُس کے حسیں تخیّل میں مُسکراتا ہے پیار دُنیا کا

"مَیں ہوں دیوانہ اپنی دُنیا کا میں نہیں جانتا ازل کیا تھا

میں نہیں جانتا ابد کیا ہے

میری فردوس میری دُنیا ہے

میری جنّت ہے صرف یہ احساس کہ مرے ذہن و دل منوّر ہیں

عَزم سے، آرزُو سے، ارماں سے

میری دولت ہے میرا سوزِ عمل جو مجھے تابناک رکھتا ہے

سِرّ مرگ و حیات کیا معلُوم

ہے ابھی تک یہ راز نامعلُوم"

آج بھی اُس کا دل دھڑکتا ہے

اپنی دھرتی کے ذرّے ذرّے میں گونج ہے نغمۂ عقیدت کی

کھیتوں میں پھُولوں میں ہواؤں میں

یہ مری جنم بھُوم یہ ماتا یہ زمیں، یہ پوتر میری زمیں!

جس کی آغوش سے میں اُٹھا تھا جس کی آغوش میں میں خاک ہوا

جو ازل تھی مرا، ابد ہے مرا

یہ زمیں خواب گاہِ افسانہ یہ زمیں بارگاہِ رمز و فسوں

اہلِ دستور کا یہ قصرِ بلند اہلِ دانش کی بارگاہِ شعور

اور اس سرزمیں کے اہلِ دماغ!؟

کبھی ماضی ہے اِن کا دامن کش   کبھی امروز اِن کی راہ میں ہے

کبھی تخیّل کی فسانہ گری

انہیں اک راستہ دکھاتی ہے

کبھی تہذیب کا جمالِ قدیم   کبھی تعلیم کے نئے پرتو

کبھی جلوے عُروسِ جدّت کے   کبھی انوار خالصیّت کے

کبھی آئیں کے خال و خد کی دمک   اور کبھی داغ اُس کے چہرے کے

مگر اس مستقل کشاکش میں   فکر و نقد و نظر کے یہ شیدا

بھُول جاتے ہیں اُن "غریبوں" کو   جن کی خاطر جلائی جاتی ہے

شمعِ تہذیب، مشعلِ قانُون!

آج بھی وقت کے تلاطُم سے
وَرطۂ انتشار سے پیہم　　اُفقِ اضطراب سے ہمدَم
ایک پرچھائیں سی اُبھرتی ہے
اپنے ہونٹوں میں داستاں لیکر

کیوں تمہیں شوق ہے جُدائی کا　　اپنی دھرتی سے بیوفائی کا
جس سے ہے گرم سینۂ تاریخ　　تم وہ سوزِ حیات بھُول گئے
شمعِ وحدت، حریمِ کثرت میں　　نسل ہا نسل سے فروزاں ہے
ضوفشاں ہے دلوں میں صدیوں سے　　قرنوں سے رُوح میں چراغاں ہے
جان روشن ہے جس سے تن روشن
تم وہ شمعِ حیات بھُول گئے

وطن اپنا ہے مشترک میراث　　مشترک دولتِ حیات ہے یہ
مشترک اپنی کائینات ہے یہ
مظہرِ عظمت و ثبات ہے یہ

زندگی نے پرُو دیا ہے ہمیں　　ایک ہی آرزُو کے رشتے میں
ایک ہی جُستجو کے رشتے میں

جیت اور ہار کے تصوّر نے　　مل کے جینا سکھا دیا ہے ہمیں
خوف و اُمید کے تاثّر نے　　ایک وحدت بنا دیا ہے ہمیں
ساری تاریخ کا نچوڑ ہے جو
تم وہ رمزِ حیات بھُول گئے

ہم رفیقِ سلاسل و زنداں　　رسَن و دار کے جلیس ہیں ہم
ہم شریکِ مصائبِ دوراں　　بھوک اور پیاس کے انیس ہیں ہم
غم کے ساتھی ہیں عیش کے ساتھی
اصطلاحِ وفا پرستی میں
ایک ہے سب کی ذات بھُول گئے

ماضی تھا اشتراک کی تصویر　　حال ہے اشتراک کا مظہر

مشترک حال، مشترک فردا

اے مُسافر ترا مقدّر ہے ابدی اتحّاد کی منزل
منزلِ افتخارِ آزادی
زندگی کے وقار کی منزل

خندۂ صبحِ نو میں ہے محفوظ ہار اک نوشگفتہ پھولوں کا
جیسے قرنوں کی جدوجہد کے بعد
آنسُوؤں سے وفا نے گوندھا ہے
جاوداں ہار یہ محبّت کا!

آج بھی وقت کے تلاطُم سے ایک پرچھائیں سی اُبھرتی ہے
اور تصوّر میں ڈُوب جاتی ہے

اُس کے احساس کے خیاباں میں
دردِ انسانیت کا چشمہ تھا

اور وہ سرچشمہ اب بھی جاری ہے

قومیّت کے لباسِ زرّیں میں — خندہ فرما عجوزِ رجعت ہے
اِس کے سینے سے اُبلا پڑتا ہے — عزم ماضی کو زندہ کرنے کا
حکمتِ نو سے بے سبب نفرت — حکمتِ کرم خوردہ پر مٹنا
ارتقا کے وجود سے انکار — مُردہ دنیا کے عشق میں سرشار
زندگی کی تلاش کھنڈروں میں — مقبروں کی مجاوری کا جنوں
حال و فردا سے قطعِ فکر و خیال — زندہ دُنیا سے بے رُخی کا جواز
حکمت و علم ہو کہ تہذیبیں — ہو تمدّن، فنون یا تاریخ

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
یہ چراغِ خرد بجھاتی ہے

نشہ یہ دیتی ہے خامکاروں کو
کہ ہو تم علم کے ہمالہ پر

فہم و دانش کے آسمان پہ ہو

یہ حقیقت کو مسخ کرتی ہے
یہ اخوّت کو مسخ کرتی ہے

کتنی سچائیوں کے چہروں پر
ڈال دیتی ہے یہ دبیز حجاب

عصبیّت کے بے پناہ نقاب

دولتِ فکر لوٹ لیتی ہے
چھین لیتی ہے نور آنکھوں کا

اور اندھیرے بکھیر دیتی ہے

کاش سوچو کہ دورِ ماضی میں
کس قدر زخم ہم نے کھائے ہیں

کتنے ظلم و ستم اُٹھائے ہیں

کاش تاریخ کے ورق اُلٹو
کاش لو جائزہ حقائق کا

کاش دل سے کبھی سوال کرو
کاش اپنے ضمیر سے پوچھو

کیوں یہ رشکِ جناں غلام ہوا

کیوں یہ صدیوں تلک غلام رہا

اِس حقیقت کو کاش تم مانو!
کہ یہ جنّت نشاں وطن اپنا

مل کے دُنیا کے ساتھ چل نہ سکا
اپنے گرداب سے نکل نہ سکا

کبھی پندارِ خود پرستی سے کاش پوچھو کہ زندگی کیا ہے
رمز و اسرارِ زندگی کیا ہیں سرِّ انسان دوستی کیا ہے
نہیں انسان دوستی ہمدم یہ تو معراجِ آدمیّت ہے
امنِ عالم کے قصر کی ہے کلید زینۂ بارگاہِ عظمت ہے
دو دھڑکتے دلوں کا مل جانا جشنِ بے تابیٔ محبت ہے
ساری دُنیا سے پیار کا جذبہ ساری دُنیا سے ارتباطِ دوام
عنصرِ منصبِ نبوّت ہے

ہے گُلِ سرسبد تو پھول وہی جس کی خوشبو فقط چمن ہی نہیں
کوہ و صحرا خزاں پہ چھا جائے
جس کی خوشبو جہاں پہ چھا جائے
یُوں اُڑے قلب و جاں پہ چھا جائے

کس نے دیکھا ہے لالۂ صحرا؟

پھر زمان و مکاں میں گونج اُٹھی
اُس کے احساس کی صدائے قدم

من کے آنگن میں چل رہا ہے وہ
چُپ کیے ہونٹوں سے بولتا ہے وہ

آدمی ہجر سہہ نہیں سکتا — کٹ کے دُنیا سے رہ نہیں سکتا
جُرم ہے جُرم ہے غمِ دُوری — کفر ہے کفر ہے یہ مجبُوری
بزمِ فطرت ہے پیار کی محفل — کائنات ایک وصل گاہِ حیات

رقص گاہِ محبّتِ ابدی

پھُول ہیں ہمکنار غُنچوں سے — ہیں بغل گیر خار پھُولوں سے
شاخ سے شاخ اس طرح ہے قریب — جیسے ڈالے ہوئے کمر میں ہات

سکھیاں کرتی ہوں رقص ہالے میں

کرنیں جب تک گلے لگاتی ہیں   خاک کے بے ثبات ذرّوں کو

دُور ذرّوں سے کب ہے مہرِ مُنیر؟

نُور افشاں ہے چاندنی جب تک   خاک سے دُور کب ہے ماہِ تمام؟

ایک طُوفانِ وصل و قُربت ہے

جیسے ہر شئے ہو حلقۂ آغوش

اور سَاقیٔ رنگ و بُو پیہم   جامِ طلعت لنڈھائے جاتا ہے

اُس کی نظروں میں کوئی غیر نہیں   ہر کِسی کو پلائے جاتا ہے

یہ تو بُت ہم نے خود تراشے ہیں   رنگ اور نسل ملک و قوم و وطن

نارسَا ذہن کے سلاسل ہیں   فرقوں اور مذہبوں کے یہ بندھن

ہے طلسمِ جہات بازیچہ   آدمی کے زمانِ طفلی کا

کشش و قُربِ نوجوانی سے   سمٹ آئیں گے مشرق و مغرب

ایک ہو جائیں گے شمال و دکن

جو رہینِ تغیّرات نہیں   موت ہے موت وہ حیات نہیں

خودُ ہے اپنی شکست کی تحریک   جسے کہتے ہیں حلقۂ زنجیر

عندلیبانِ فصلِ گُل اک دن وہ نیا معجزہ دکھائیں گے
باغباں جو دکھا نہیں سکتے

اپنے نغموں سے مطربانِ شباب باغ کے رنگ رنگ پھولوں کو
اک نئے ہار میں پرو دینگے

جنّتِ اتحّاد ہوگا چمن جشن گاہِ نشاط ہوگی یہ خاک
وحدتِ لازوال ہوگا چمن

وقت کے بے کراں اندھیروں میں
اک کرن نورپاش ہے اب تک یہ کرن رہنما ستارہ ہے
نور اُس کا کلام کرتا ہے
سُنو طوفاں سے کانپنے والو!
یاس اک سرخوشی ہے منزل کی قہرِ دریا نشاطِ ساحل ہے
طوفاں اک عشرتِ تموّج ہے
رقصِ امواج ہے نہیں گرداب خندۂ آب ہے نہیں سیلاب
جادہ پیمائیاں مبارک ہوں آبلہ پائیاں مبارک ہوں

زیرِ پا کھل رہی ہے فصلِ گلاب

دردِ کم مائگی مُبارک باد
ظلمتِ زندگی مُبارک باد

نہیں ظلمت، شعاعِ نُور ہے یہ
نہیں پستی، فرازِ طُور ہے یہ

نُور کا شب ستاں ہے تاریکی
صبح کی خوابگاہ ہے شبِ تار

بَس رہا ہے بطُونِ رجعت میں
نفسِ ارتقاء کا سوز و گداز

نہیں یہ دردِ خستگی ہر دم
ہے نئی تازگی کا کربِ ظہُور

اک نیا خندۂ توانائی

سنگ کے بدنما نقابوں میں
قصر سونے کے جگمگاتے ہیں

ارضِ جامد کی بزمِ خاکی میں
جامِ بلّور کھنکھناتے ہیں

لالہ و گُل پہ یہ شرار نہیں
ہے تبسّم عرُوسِ شبنم کا

برقِ رقصاں نہیں گلستاں پر
شمع ہے یہ حریمِ لالہ کی

خس و خاشاک کا یہ ڈھیر نہیں
ہے سراپردۂ نسیمِ بہار

گرم بادِ خزاں کے جھونکوں میں
پرورش پا رہی ہے فصلِ بہار

ایک دن سرحدوں کے اژدرہا
دوشِ گیتی پہ ہونگے زُلفِ نگار

اس سے پھوٹیگا چشمۂ حیواں | جسے دُنیا سمجھ رہی ہے سراب
کیوں خیالِ عذاب میں گُم ہے | صرف تُو ہے عذاب ہے نہ ثواب
نہیں بادِ سمُوم فِتنوں کی | موسمِ امن کی صبا ہے یہ

سینۂ انتہا کا کرب نہیں

خندۂ رُوحِ ابتدا ہے یہ

مرحبا میرے عہد کے آثار | آج وجدان بھی ہے رشکِ خرد
فکر کے ہر ڈُباؤ میں نغمے | نغمے کی ہر الاپ میں افکار
ہر اشارہ ہے اک خزینۂ رمز | ہر کنایہ ہے مخزنِ اسرار
ہر اندھیرا ہے نُور کا دریا | ہر کرن اک بحیرۂ انوار

دَورِ حکمت ہے عہدِ فکر ہے یہ

آدمی کے شباب کا ہے یہ عہد

زندگی کے شباب کا ہے یہ عہد

عہد احساسِ آدمیّت کا | عہد انسانیت کی عظمت کا

آج نَوروز ہے اخوّت کا

ایک لَے ہر رباب میں گُونجے | ایک دُھن ہر ستار سے پھُوٹے

اک تمنّا ہو سب تمنّائی ایک جلوہ ہو سب تماشائی

ایک لیلیٰ تمام سودائی

ٹکڑے ٹکڑے کرو یہ سنگینیں توڑ دو آہنی یہ تلواریں

اور خونِ باراِن کے ٹکڑوں کو دفن کردو کسی کہستاں میں

جتنے راکٹ ہیں پاش پاش کرو اور اِن راکٹوں کے ملبے کو

غرق کر دو کسی سمندر میں

لہک اُٹھّے چمن محبّت کا مہک اُٹھّے مشامِ انسانی

زخم خوردہ دلوں کے زخم بھریں

دل کے داغوں میں پھول کھل اُٹھّیں

ذرّے ذرّے میں مُسکرائے بہار

گو چمن میں ہیں رنگ رنگ کے پھول اور ہر پھول کی جُدا خوشبو

اور ہر پھول کی بہار جُدا

رُوحِ گُل سے مگر ہے عشق جسے خود کو جو عندلیب کہتا ہے

اُس پہ تمیزِ رنگ و بُو ہے حرام

گونج ذہنوں میں ہے دھماکوں کی
گھن گرج زلزلوں کی رُوحوں میں
اک قیامت بپا خیالوں میں
لیکن اس کارزارِ طوفاں میں شانتی ون کے ذرّے ذرّے سے
نغمہ یہ زندگی کا جاری ہے
جیئو اور دُوسروں کو جینے دو
تشنہ کاموں کی تشنگی کی قسم
پیئو اور دُوسروں کو پینے دو
نغمہ یہ زندگی کا جاری ہے
جیسے اک چشمۂ سرِ کہسار
جسے فُرصت نہ ہو خموشی کی

روحِ اُمّید مسکراتی ہے
ہر نفس یہ یقیں اُبھرتا ہے
کہ کشش اس حسین نغمے کی
دُوریوں کے حجاب اُٹھا دیگی
نہیں یہ دَور جہل و وحشت کا
حق کے رُخ سے نقاب اُٹھا دیگی
شورِ محشر ہے ہر طرف پھر بھی
شانتی وَن کے ذرّے ذرّے سے

نغمہ یہ زندگی کا جاری ہے
جیئو اور دُوسروں کو جینے دو
تشنہ کاموں کی تشنگی کی قسم
پیئو اور دُوسروں کو پینے دو
نغمہ یہ زندگی کا جاری ہے
جیسے اک چشمۂ سرِ کہسار
جیسے فرصت نہ ہو خموشی کی!